احمد آباد گجرات کا سب سے بڑا شہر ہے۔ سلطان احمد شاہ نے ۱۴۱۱ء میں اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسی کے نام پر اس کو احمد آباد کہا جانے لگا۔ ۱۵۷۲ء میں مغل حکمراں اکبر نے اس پر قبضہ کرلیا۔ ۱۸۱۸ء میں وہ برطانیہ کے ماتحت آگیا۔ انگریزی دور میں یہاں پہلی کاٹن مل ۶۱-۱۸۵۹ء میں قائم کی گئی۔ احمد آباد اس وقت ہندستان کا پانچواں سب سے بڑا شہر ہے۔

راستہ میں مختلف اخبار دیکھے۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۲ نومبر) کے ادارتی صفحہ کے اوپر حسب معمول ویلیس (W.R. Wallace) کا یہ قول نقل کیا گیا تھا کہ جو ہاتھ گہوارہ کو چلاتا ہے وہی وہ ہاتھ ہے جو دنیا پر حکومت کرتا ہے:

The hand that rocks the cradle
is the hand that rules the world.

یہی عورت کا اصل مقام ہے جو فطرت نے اس کو عطا کیا ہے۔ وہ اس نسل کو تیار کرتی ہے جو بالآخر باہر آکر دنیا کے تمام کاروبار کو سنبھالتی ہے۔ اس اعتبار سے عورت گویا معمار انسانیت ہے۔ مگر جدید تہذیب نے برابری کے مصنوعی اور غیر فطری تصور کے تحت عورت کو گھر کے اندر کے عظیم کردار سے محروم کر دیا۔ اور گھر کے باہر کا رول ادا کرنے کے قابل تو وہ تھی ہی نہیں۔

انگریزی اخبار دی ہندو (۱۲ نومبر) میں مسٹر اندرسین کے ایک آرٹیکل (ہندو ۲۲ اکتوبر) کی حمایت میں مسٹر وی کیسوران (مدراس) کا خط چھپا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہمارے کانسٹی ٹیوشن کے بنانے والوں نے یہ بہت بڑا بلنڈر کیا کہ انھوں نے بالغ رائے دہی (adult franchise) کے اصول کو دستور میں جگہ دی۔ ہمارے ملک کی اکثریت جاہل اور بے شعور ہے۔ ایسی حالت میں ہر بالغ آدمی کو ووٹ کا حق دینا گویا قوم کو ایسے لیڈروں کے حوالے کرنا ہے جو خوش نما نعروں کے ذریعہ انھیں بے وقوف بناتے رہیں۔

اس کے نتیجہ میں جو سیاسی کرپشن پیدا ہوا اس کی مثال دیتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ رومن ایڈمنسٹریٹر پبلی کولا (Publicola) جب مرا تو اس نے اتنی رقم بھی نہیں چھوڑی تھی جس سے اس کی آخری رسوم ادا کی جاسکیں۔ جب کہ ہمارے ملک کے حکمراں ایک بار حکومت میں آنے کے بعد اتنی دولت جمع کر لیتے ہیں جو ان کی کئی پشتوں کے عیش کے لئے کافی ہو۔

جہاز بڑودہ پہنچا تو یہاں سیمنار کے لوگ رہنمائی کے لئے موجود تھے۔ چوں کہ میرے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا اس لئے ٹھہرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایئر پورٹ سے مسٹر عظیم بندوق والا کے ساتھ روانگی ہوئی۔ وہ مسٹر جے ایس بندوق والا کے صاحبزادے ہیں اور کمپیوٹر انجنیئرنگ کا کورس کررہے۔ جب میں بڑودہ کی سڑکوں سے گزر رہا تھا تو یہاں کی ہر چیز مجھے دہلی کے مقابلہ میں پسماندہ نظر آئی۔ پھر میں نے سوچا کہ اسی طرح دہلی، یورپ اور امریکہ کے ترقی یافتہ شہروں کے مقابلہ میں پسماندہ محسوس ہوتا ہے۔ ذہن کا مسافر مزید آگے بڑھا تو خیال آیا کہ آدمی جب جنت کے شہر میں داخل ہوگا تو وہ پائے گا کہ پیرس اور واشنگٹن بھی مزید اضافہ کے ساتھ جنتی شہر کے مقابلہ میں انتہائی پس ماندہ تھے۔

ہماری گاڑی بڑودہ کی مختلف سڑکوں سے گزرتی رہی۔ یہاں تک کہ ہم لوگ اس علاقہ میں پہنچ گئے جس کو فرٹیلائزر نگر کہا جاتا ہے۔ یہاں گجرات فرٹیلائزر کا وسیع گیسٹ ہاؤس (Shin Atami Guest House) ہے۔ میرے قیام کا انتظام اس کے اندر کیا گیا تھا۔ لیکن جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو رسپشن ڈسک پر کوئی موجود نہ تھا۔ صرف سیکورٹی گارڈ کا ایک آدمی پستول لٹکائے ہوئے گھوم رہا تھا۔ عظیم بندوق والا ڈھونڈنے کے لئے نکلے اور کچھ دیر میں ایک آدمی کو لے کر آئے۔ اس نے روم نمبر ۶ ہمارے لئے الاٹ کیا۔

ایک صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ سرکاری گیسٹ ہاؤس ہے اس لئے یہاں ایسا پیش آیا۔ اگر یہ پرائیویٹ ہوتا تو آپ دیکھتے کہ گیٹ میں داخل ہوتے ہی ایک شخص یہاں آپ کے استقبال کے لئے موجود ہے۔

ایک گفتگو کے دوران ایک" گاندھی بھگت "نے کہا کہ مہاتما گاندھی تو دیش کے بٹوارہ کے لئے آخر وقت تک راضی نہیں تھے۔ مگر نہرو اور دوسرے کانگرسی لیڈروں نے دیکھا کہ انگریز مسٹر جناح کے ذریعہ آزادی میں اڑنگا لگائے ہوئے ہے۔ وہ اس اڑنگے کو استعمال کرتا رہے گا اور کبھی ہم کو آزادی نہیں دے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم لوگ ایک ایک کرکے مرجائیں گے اور بھارت کو اپنے خوابوں کا دیش نہیں بنا سکیں گے۔ اس بنا پر نہرو وغیرہ نے بٹوارہ کو مان لیا تاکہ انگریزوں کے سیاسی قبضہ سے چھٹکارا حاصل کرکے دیش کی تعمیر کی جاسکے۔

نہرو کا خواب کیا تھا۔ وہ پہلے ہی انھوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھ دیا تھا کہ میں انڈیا کو ایک سوشلسٹ انڈیا دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ اقتدار پر قبضہ کرکے ہم بڑے پیمانہ پر پبلک سکٹر بنائیں گے اور ہر شعبہ میں ایسے معیاری ادارے قائم کریں گے جو پرائیوٹ سکٹر کے لئے بطور نمونہ کام دے گا۔ چنانچہ نیشنل گورنمنٹ قائم ہونے کے بعد نہرو اور ان کے ساتھیوں نے ملک کی دولت کا بڑا حصہ پبلک سکٹر قائم کرنے میں جھونک دیا۔ مگر چالیس سالہ تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ نام نہاد پبلک سکٹر صرف کرپشن کا ذریعہ ہے۔ مزید یہ کہ اس نے پوری قوم کو کاہل (lethargic) بنا کر رکھ دیا۔

اس طرح نہرو کی قیادت نے ملک کو دوہرا نقصان پہنچایا ہے۔ اس نے مسٹر جناح کے "اڑنگے" کو غیر ضروری اہمیت دی جس کے نتیجہ میں ملک کے ٹکڑے ہو گئے۔ اور دوسری طرف حاصل شدہ ہندستان کو اقتصادی تباہی کی خندق میں گرا دیا۔ نہرو کو ہندستان سے بے پناہ محبت تھی جس کا اندازہ ان کے وصیت نامہ سے ہوتا ہے۔ لیکن اگر سوچ درست نہ ہو تو محبت بھی الٹا نتیجہ پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ مسلم ملکوں میں بھی پیش آیا۔ مسلم ملکوں کے اسلام پسند مخلصین نے اپنی فکری غلطی کے تحت ہر جگہ سیاسی چھلانگ لگائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دور جدید میں اسلامی دعوت کے تمام امکانات برباد ہو کر رہ گئے۔

گیسٹ ہاؤس کے کمرہ میں پہنچ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ دیواروں کے پردے ہٹا دئے۔ اس طرح کے کمروں میں عام طور پر باہر کی طرف قدرتی مناظر ہوتے ہیں۔ مگر جدید تہذیبی رواج کے مطابق، اس پر لمبا پردہ پڑا رہتا ہے۔ مجھے ایسا پردہ پسند نہیں۔ پردہ کو ہٹانے کے بعد لمبے شیشہ کے اُس پار فطرت کے ہرے بھرے مناظر دکھائی دینے لگے۔ اس کے بعد کچھ دیر تک مسٹر بندوق والا سے گفت گو ہوئی۔

مسٹر عظیم بندوق والا گویا مسلمانوں کی "کمپیوٹر جنریشن" کے نمائندہ ہیں۔ انھوں نے صفائی کے ساتھ کہا کہ میرے گھر کے لوگ اگرچہ روایتی طور پر مذہبی رہے ہیں۔ مگر میں تو ایک ملحد (atheist) ہوں۔ میں مذہب میں اعتقاد نہیں رکھتا:

I don't believe in religion.

سوالات کے دوران اندازہ ہوا کہ اس الحاد کے پیچھے کوئی گہرا شعور یا کوئی سوچا سمجھا فکر نہیں ہے۔ بس آزادی اس کا سبب ہے۔ ایسے نوجوانوں کو اینٹی مذہب سے زیادہ اینٹی اتھارٹی (anti authority) کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہماری نسل کے لوگ جب مل کر بیٹھتے ہیں تو وہ مذہب یا پالی ٹکس کی بات نہیں کرتے۔ ان کی بات چیت کا موضوع فلم، کھیل، وغیرہ ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ لوگ اپنے کو لامذہب نہ کہئے بلکہ آزادی پسند کہئے۔ کیوں کہ آپ لوگوں کی لامذہبیت کے پیچھے کوئی عقلی یا سائنٹفک دلیل نہیں ہے۔

یہاں انڈین ایکسپریس کا بڑودہ اڈیشن (۱۲ نومبر ۱۹۹۴) دیکھا۔ اس میں لیٹرس کے کالم میں احمد آباد کے مسٹر سدھیر ترویدی کا خط تھا۔ انھوں نے ایک صاحب کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا تھا کہ سردار پٹیل کو انڈیا کا لوہ پرش (Iron Man) کہا جاتا ہے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کو سنہہ پرش (Lion man) کہا جائے۔ یعنی شیر ہند۔ اسی طرح کچھ لوگوں نے سر فضل الحق کو شیر بنگال کہا۔ کچھ لوگوں نے شیخ عبد اللہ کو شیر کشمیر کا لقب دیا۔ وغیرہ۔ مگر شیروں کی اس کثرت کے باوجود ہمارے ملک کا کوئی مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آزادی کے بعد ہمیں دھاڑنے والے شیروں کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ایسے خاموش انسانوں کی ضرورت تھی جو تدبیر اور حکمت کے ساتھ ملک کو ترقی کی طرف لے جانے کا منصوبہ بنائیں۔

۱۲ نومبر کو دوپہر سے پہلے میں بڑودہ پہنچ چکا تھا۔ ایک بجے گیسٹ ہاؤس کا آدمی آیا۔ اس نے کہا کہ کھانا تیار ہے۔ میں کمرہ سے نکلا تو دروازہ کا تالا بند کرنے کے لئے چابی موجود نہیں تھی۔ میں نے آدمی سے کہا کہ "چابی تو تم نے دی نہیں"۔ اس نے جواب دیا: "چابی کی ضرورت نہیں صاحب"۔ چنانچہ میں دروازہ مقفل کئے بغیر نیچے اتر گیا۔

کھانے کی میز پر میں اور پروفیسر رشید الدین صاحب (جامعہ ہمدرد) تھے۔ جو آدمی کھانا رکھ رہا تھا، اس سے میں نے نام پوچھا۔ اس نے کہا "عبدل بھائی"۔ میں نے کہا کہ یہ تو اصل نام معلوم نہیں ہوتا۔ اس نے کہا کہ میرا اصل نام عبد الغنی ہے۔ یہاں لوگ مجھ کو عبدل بھائی کے نام سے پکارتے ہیں۔

پروفیسر رشید الدین ایک ذی علم اور تجربہ کار آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بہت سے قصے سنائے۔ انھوں نے بتایا کہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۴ کو کانپور میں علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک جلسہ تھا۔ اس جلسہ کے صدر جن ستا کے اڈیٹر مسٹر پربھاش جوشی تھے۔ اور پروفیسر رشید الدین اس میں مقرر کی حیثیت سے بلائے گئے تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اسلام کا تعارف کرتے ہوئے بتایا کہ اسلام کی بنیاد چار چیزوں پر ہے ــــــ علم، عقل، عدل، رحیمیت (compassion) ۔ پربھاش جوشی جو پہلے سے پروفیسر رشید الدین کو جانتے تھے، انھوں نے آخر میں اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مجھے اگر پروفیسر رشید الدین جیسے ۱۰۱ مسلمان مل جائیں تو میں اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔

پروفیسر رشید الدین نے الرسالہ مشن کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ یہ بہت ضروری ہے کہ لوگوں کا دل جیتا جائے۔ آج ہمیں کنفرنٹیشن کی نہیں بلکہ پرسویشن (Persuasion) کی ضرورت ہے۔

۱۲ نومبر کی شام کو میں اپنے کمرہ کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ یہ دروازہ ایک پارک کی طرف کھلتا تھا۔ دور تک پھول اور درخت اور ہریالی کا منظر تھا۔ میں نے سوچا کہ پارک اس گیسٹ ہاؤس کی عمارت کی رونق ہے۔ عمارت کے ساتھ اگر یہ "باغ" نہ ہو تو گیسٹ ہاؤس بالکل سونا دکھائی دینے لگے۔

یہ سوچتے ہوئے قرآن کی آیت یاد آئی: ومساكن طيبة في جنات عدن۔ ان الفاظ میں قرآن نے جنت کی منظر کشی کی ہے۔ یعنی جنت میں پاکیزہ مکانات ابدی باغوں میں ہوں گے۔ ایک عمدہ مکان کے بارہ میں انسان کا تصور یہی ہے کہ وہ باغ کے درمیان ہو۔ انسانی تخیل آج بھی اس سے آگے نہ جاسکا۔ قرآن یا اسلام کی صداقت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس کی ہر بات اپنے آخری معیار پر ہے۔ کوئی فلسفی یا کوئی آرٹسٹ کسی بھی چیز میں قرآن کے معیار سے آگے کا معیار پیش کرنے پر قادر نہیں۔

۱۲ نومبر کی شام کو کھانے کا اجتماعی نظام جیوتی گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ مغرب کی نماز سے فراغت کے بعد پروفیسر رشید الدین، پروفیسر امریک سنگھ اور میں کار میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ یہ

تقریباً آدھ گھنٹہ کا راستہ تھا۔ راستہ میں دونوں صاحبان بات کرتے رہے۔ میں زیادہ تر ان کی باتیں سنتا رہا۔

پروفیسر امریک سنگھ نے کہا کہ گری لال جین (سابق اڈیٹر ٹائمس آف انڈیا) سے میری بہت باتیں ہوتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اسلام کی مخالفت کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام صرف اپنے کو برحق بتاتا ہے، باقی جتنے مذہب ہیں سب اس کے نزدیک کمتر یا غلط ہیں۔ پروفیسر امریک سنگھ نے ان کو جواب دیا کہ تم یہ نہ دیکھو کہ کتابوں میں کیا لکھا ہوا ہے۔ اصل یہ ہے کہ تمام آدمی سماجی دباؤ (social compulsion) کے تحت کام کرتے ہیں۔ مسلمان اس عام اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ سماجی دباؤ مسلمانوں کو اپنے آپ معتدل بنا دیتا ہے۔

پروفیسر رشید الدین نے کہا کہ یہ صرف اسلام یا مسلمانوں کی بات نہیں۔ جب بھی آدمی کسی راستہ کو اختیار کرتا ہے تو اس کو یہی سمجھنا پڑتا ہے کہ یہی واحد راستہ ہے:

It is the only right path.

آدمی کو جب تک اپنے مذہب پر یقین نہ ہو وہ اس کو پوری طرح اختیار نہیں کرسکتا۔ اس لئے لوگوں کو اپنے اپنے یقین پر رہنے دیجئے۔ البتہ ان کو یہ بتائیے کہ اپنے مذہب پر یقین رکھتے ہوئے تم دوسرے مذہب والوں کا احترام کرو۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہماری گاڑی جیوتی گیسٹ ہاؤس میں داخل ہوگئی۔ یہ شہری ماحول کے درمیان گویا ایک نخلستان تھا۔ یہاں خوبصورت لان میں لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد لوگوں نے کھانا کھایا۔ یہاں تمام لوگ صرف انگریزی زبان استعمال کر رہے تھے۔ یہاں ہر چیز "انگلش" معیار پر نظر آئی۔

میں نے سوچا کہ ہندستان دو ہندستان ہے۔ ایک وہ ہندستان جس میں اس ملک کے ۹۵ فیصد لوگ رہتے ہیں۔ دوسرا وہ جس میں صرف پانچ فیصد لوگ آباد ہیں۔ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ میرا مشن ہر آنکھ کے آنسو پوچھنا ہے۔ مگر آزادی کے بعد جو ہندستان بنا وہ عملاً اس کے برعکس تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ خواہ ہندستان ہو یا اور کوئی ملک، محض سیاسی حکمرانوں کی تبدیلی سے سماجی حالات نہیں بدل سکتے۔

کھانے کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر آ گئے۔ خلاف معمول آج مجھے دیر میں نیند آئی۔ میری حالت اس انسان کی سی تھی جو نہ مروجہ ماحول میں خوش رہ سکے۔ اور نہ وہ دوسرا ماحول اپنے موافق بنانے پر قادر ہو۔

سمینار میں شریک ہونے والے لوگوں سے، نیز شہر کے اہل علم سے مختلف اوقات میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان سے جو باتیں ہوئیں ان میں سے کچھ مختصر طور پر یہ ہیں۔

ایک ہندو پروفیسر نے کہا کہ جین دھرم کے بانی مہاویر ڈھائی ہزار سال پہلے پیدا ہوئے۔ ان کا گرنتھ بہت دنوں تک زبانی طور پر چلتا رہا۔ صرف ایک ہزار سال پہلے اس کو لکھا گیا۔ ہندوؤں کے وید اور بھی ہزاروں سال پہلے سے ہیں۔ مگر وہ بھی صرف پہلی صدی عیسوی میں لکھے گئے۔ ایسی حالت میں کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ جین دھرم اور ہندو دھرم کے جو گرنتھ پستکوں کی صورت میں ہمارے پاس ہیں وہ ٹھیک وہی ہیں جیسا کہ وہ شروع میں تھے۔ زبانی روایت میں ہمیشہ بات بدل جاتی ہے۔ اس لئے ان گرنتھوں میں بھی ضرور تبدیلی آئی ہو گی۔ پھر انھوں نے کہا کہ قرآن میں بھی ضرور ایسا ہی ہوا ہو گا۔ آج جو قرآن ہے وہ وہی نہیں ہو سکتا جو پیغمبر صاحب کے زمانہ میں تھا۔

میں نے کہا کہ دوسرے مذہب کے گرنتھوں کے بارہ میں آپ کی بات درست ہے۔ مگر قرآن کے بارہ میں تاریخی طور پر یہ بات درست نہیں۔ کیوں کہ قرآن جب اترتا تھا اسی وقت وہ لکھ بھی لیا جاتا تھا۔ دوسرے مذہبی گرنتھوں کے برعکس، قرآن وہ استثنائی کتاب ہے جس میں تلاوت اور تحریر دونوں اول دن سے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ اس لئے قرآن میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ ہم دنیا میں ایک بلین سے زیادہ ہیں۔ اگر سب مل کر کام کریں تو ہم بہت بڑی طاقت بن سکتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے چند تجویزیں پیش کیں ——— مسلم ممالک اپنے درمیان کامن ڈیفنس کا ایک نظام بنائیں۔ مسلمان اپنی ایک عالمی نیوز ایجنسی قائم کریں۔ مسلم ملکوں کی ایک یونائیٹڈ آرگنائزیشن ہو۔ مسلم ملکوں کا ایک سنٹرل بینک بنایا جائے۔ مسلم ملکوں کا ایک کامن مارکٹ قائم کیا جائے۔ اس قسم کی کچھ بڑی بڑی تجویزیں پیش کرنے کے بعد انھوں نے کہا:

A beginning has to be made. Let us make a beginning.

میں نے کہا کہ یہ آغاز نہیں ہے۔ آپ اختتام سے آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ آغاز تو ہمیشہ ابتدا سے ہوتا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے لئے ایک ہی نقطۂ آغاز ہے، اور وہ تعلیم ہے۔ ہمارے درمیان جب تک تعلیم عام نہ ہو جائے، کوئی بھی بڑا کام نہیں کیا جاسکتا۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہمیشہ صبر و اعراض کی بات کرتے ہیں۔ یہ تو مسلمانوں کی غیرتِ ملّی کے خلاف ہے۔ میں نے کہا کہ یہ غیرتِ ملّی کا مسئلہ نہیں، بلکہ یہ حیثیتِ ملّی کا مسئلہ ہے۔

مسلمان عام معنوں میں کوئی قوم نہیں ہیں۔ وہ پیغمبر آخر الزماں کی امت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ ان کو دعوت کا وہ کام انجام دینا ہے جس کے لئے پیغمبر آیا کرتے تھے۔ مسلمان اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا تعلق ہے نہ کہ ایک قوم اور دوسری قوم کا۔

مسلمان کی یہی حیثیت اس کے اوپر لازم کر دیتی ہے کہ وہ اپنی مدعو قوموں کی زیادتیوں پر صبر کرے۔ اس ملک میں مسلمان پندرہ فیصد ہیں اور غیر مسلم پچاسی فیصد۔ ایسی حالت میں لازماً ایسا ہوگا کہ دوسروں کی طرف سے مسلمانوں کو ناخوشگواری یا زیادتی کا تجربہ ہوگا۔ اس ناخوشگواری یا زیادتی کے مقابلہ میں انھیں دَعْ اَذَاهُمْ کے قرآنی اصول پر عمل کرنا ہے۔ اگر مسلمان ایسا نہ کریں تو اس کے بعد ان کا امت محمدی ہونا خدا کی نظر میں غیر متحقق ہو جائے گا۔ جو ماں اپنے بچہ کی باتوں کو برداشت نہ کرے وہ ماں ہی نہیں۔

ایک طالب علم نے کہا کہ آج کا نوجوان پیچھے کی طرف نہیں دیکھتا۔ وہ صرف آگے کے بارہ میں سوچتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ ہمارے کتنے نوجوان ایسے ہیں جو سائنٹفک ریسرچ میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے تو آج تک کوئی اسٹوڈنٹ ایسا نہیں ملا جو یہ کہے کہ میں اپنی زندگی سائنسی ریسرچ کے لئے وقف کر دوں:

My intention is to devout my life in scientific research.

میں نے کہا کہ پھر آپ کو یہ کہنا چاہئے کہ آج کا نوجوان صرف پیسہ یا کیریر کے بارہ میں سوچتا ہے۔ یہ آگے کی طرف سوچنا نہیں ہے۔ آگے کی طرف سوچنا یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں ریسرچ کا شوق ہو۔

وہ نئی نئی چیزیں دریافت کرنا چاہتے ہوں۔ وہ دنیا کو کوئی نیا سائنسی تحفہ دینے کا حوصلہ رکھیں۔

۱۲ نومبر کی صبح کو ہم لوگ اپنی قیامگاہ سے وانیجیا بھون (ریس کورس سرکل) لے جائے گئے یہاں کے ہال میں ساڑھے نو بجے سمینار کا پہلا سیشن شروع ہو رہا تھا۔ اس کے چیئرپرسن پروفیسر رشید الدین خاں تھے۔ اس کا موضوع تھا ——— کیا پالی ٹکس اور مذہب کو الگ کیا جاسکتا ہے:

Can politics and religion be separated?

انیس آدمیوں نے اس بحث میں حصہ لیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ سمینار گویا ذہنوں کا اختلاط (interaction of minds) ہے۔ تاہم میرا تجربہ ہے کہ یہ اختلاط تو ہے مگر وہ اتحاد نہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ کا ہر فرد خود پسند (egoist) ہوتا ہے۔ اس لئے تعلیم یافتہ لوگوں کو کسی ایک نقطۂ نظر پر متفق کرنا انتہائی مشکل ہے۔ اس سمینار میں ہر آدمی نے کوئی ایک پہلو لے کر اس پر ایک خوبصورت تقریر کر ڈالی۔ چند باتیں بطور مثال یہاں نقل کی جاتی ہیں:

ایک صاحب نے کہا کہ اجودھیا میں رام رحیم ٹرسٹ قائم کیا جائے۔ ایک صاحب نے کہا کہ انڈیا کے تمام مسائل کی جڑ جہالت اور ناخواندگی ہے۔ کسی نے کہا کہ تمام مسائل کی جڑ اقتصادی پسماندگی ہے۔ کسی نے مذہب کو، کسی نے پولٹیکل کرپشن کو، کسی نے پارٹیشن کو، کسی نے سیکولر کانسٹی ٹیوشن کو ساری خرابیوں کا ذمہ دار بتایا۔

میں نے کہا کہ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ جس دن مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا جائے گا اس دن انڈیا تباہ ہو جائے گا، دوسری طرف بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے ملانے ہی کی وجہ سے انڈیا تباہ ہوا ہے، اس لئے دونوں کو الگ کر دینا ضروری ہے۔ اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ مہاتما گاندھی نے مذہب کو اس کے اصل پہلو کے لحاظ سے لیا تھا اور آجکل کے لوگ مذہب کو سیاسی استحصال کے لئے لے رہے ہیں۔

ایک صاحب کی بات کے جواب میں میں نے کہا کہ سیاست وہی ہے جو حالات کے اعتبار سے قابل عمل ہو۔ موجودہ حالات میں مذہبی سیاست قابل عمل نہیں۔ کیوں کہ اس کے موافق ذہنی فضا ملک میں موجود نہیں۔ اس وقت ہم جن حالات کے درمیان ہیں اس میں قابل عمل سیاست صرف ایک ہے، اور وہ سیکولر سیاست ہے۔

۱۳ نومبر کی سہ پہر کو دوسرا سشن تھا۔ اس کا موضوع تھا : ہیومن رائٹس اینڈ ریلیجن۔ اس سشن میں مجھ کو لیڈ اسپیکر بنایا گیا تھا۔ جب کارروائی شروع ہوئی اور میرے بولنے کا وقت آیا۔ تو میرے پاس بیٹھے ہوئے پروفیسر گوہن نے کہا کہ صبح کے سشن میں آپ نے "ہندی" میں تقریر کی۔ میرا تعلق کیرالا سے ہے اور میں ہندی بالکل نہیں جانتا۔ اس لئے آپ انگریزی میں بولیں تاکہ میں بھی سمجھوں :

Dr. S. Guhan, Institute of Development Studies
79, Second Main Road, Gandhi Nagar,
Adyar, Madras 600 020 (Tel. 4914191)

میں نے پہلے سے انگریزی میں بولنے کی تیاری نہیں کی تھی۔ مگر ڈاکٹر گوہن کے کہنے پر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے انگریزی ہی میں بولنا ہے۔ چنانچہ میں نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ اس کے بعد تقریر شروع کی۔ خدا کے فضل سے دیر تک نہایت کانفیڈنس کے ساتھ انگریزی میں بولتا رہا۔ ڈاکٹر گوہن بہت خوش ہوئے۔ حتی کہ انھوں نے اسلام کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا کہ انشاءاللہ آپ کو انگریزی لٹریچر بھیجنے کی کوشش کی جائے گی۔

میں نے ۹ نومبر کے ٹائمس آف انڈیا کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں مسٹر روسی مودی (Russi Mody) کا ایک بیان چھپا ہے۔ وہ ایرانڈیا اور انڈین ایرلائنز کے مشترک چیرمین مقرر کئے گئے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ دونوں ہوائی کمپنیوں کے بڑھتے ہوئے مسائل کو کس طرح حل

1. Soli Sorabjee, New Delhi
2. Madhu Mehta, Bombay
3. Maulana Wahiduddin Khan, New Delhi
4. Dharma Kumar, New Delhi
5. Veenaben, New Delhi
6. Kaokab Durry, New Delhi
7. Rasheeduddin Khan, New Delhi
8. Nirmal Verma, New Delhi
9. Satish Chandra, New Delhi
10. Amrik Singh, New Delhi
11. Nagindas Sanghavi, Bombay
12. Arvind Deshpande, Bombay
13. Nikhil Wagle, Bombay
14. Teesta Setalvad, Bombay
15. S. Guhan, Madras
16. M.N. Srinivas, Bangalore
17. Sofia Khan, Ahmedabad
18. Narayan Sheth, Ahmedabad
19. Manubhai Pancholi, Ahmedabad
20. Vishnu Pandya, Ahmedabad
21. Hasanali Firashta, Surat
22. Joseph Mecwan, Anand
23. Chunibhair Patel, Baroda
24. V.N. Kothari, Baroda
25. Tulsi Boda, Baroda
26. Bhaskar Vyas, Baroda
27. I.G. Patel, Baroda
28. Nanubhai Amin, Baroda
29. G.N. Devy, Baroda
30. Alaknanda Patel, Baroda
31. J.S. Bandukwala, Baroda
32. Sanjeev Shah, Baroda

کریں گے، خاص طور پر پائلٹوں کے مسائل جو آئے دن اسٹرائک کرکے سارا نظام درہم برہم کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں یونین کے پاس صنعتی تعلقات پر لکھی ہوئی بہترین کتاب کے ساتھ جاؤں گا۔ یہ بائبل ہے۔ اس کے مشہور دس احکام میں سے دو یہ ہیں کہ دوسروں کے ساتھ وہی کرو جو تم اپنے لئے چاہتے ہو، اور اپنے پڑوسی سے اسی طرح محبت کرو جیسی محبت تم اپنے لئے پسند کرتے ہو:

Iwill go to the unions by the best book on industrial relation ever written — The Bible. As two of the ten commandments say: do unto others as you would do unto yourself, and love your neighbour as you would love yourself.

میں نے کہا کہ یہ دونوں حکم تمام مذہبوں میں پائے جاتے ہیں اور یہ بلاشبہ سماجی اخلاقیات کی بنیاد ہیں۔ اگر یہ اخلاقی اصول لوگوں کی زندگیوں میں آجائے تو تمام سماجی جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

میرا مقالہ اور میری یہ تقریر دونوں ہی سیمینار کے منتظمین نے اپنی رپورٹ کے ساتھ شائع کر دی ہیں۔ ان کا پتہ یہ ہے:

12 Amee Society
Old Padra Road
Baroda 390015

مسٹر الکنندا پٹیل (Alaknanda Patel) مسلم صوفیوں سے متاثر ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ پیغمبر اسلام کے بارہ میں بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے فلسفہ کا خلاصہ ایک لفظ "اخلاق" میں بتایا تھا۔ اور راما کرشنا دیو نے دھرم کا خلاصہ ایک لفظ میں مہربانی بتایا:

The Prophet of Islam is supposed to have summarised his philosophy with one word, 'Akhlaq', - sincerity, and Ramakrishnadev with the word 'compassion'.

نئی دہلی کی وینا بہن (Tel. 4620066) نے یونیفارم سول کوڈ کے بارہ میں کہا کہ مسلمانوں کے اوپر جبراً ایک سول کوڈ لاگو کرنا اس وقت الٹا نتیجہ پیدا کرے گا۔ ان کو یہ موقع دینا چاہئے کہ وہ آزادانہ طور پر خواہ یونیفارم سول کوڈ کے تحت اپنے نکاح کو رجسٹر کروائیں یا مسلم پرسنل لا کے تحت:

Imposing a civil code on Muslims will produce a negative result at this moment. An option should be thrown open and they should be free to get their marriages registered under either uniform civil code or Muslim personal law.

مسٹر مدھو مہتا نے کہا کہ پالی ٹکس آج کریمنل لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ پولیس کو اپنے مجرمانہ منصوبوں کے لئے ٹولی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک جج کو یہ کہنا پڑا کہ مجھ کو پولیس سے بچاؤ۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے سپریم کورٹ آف انڈیا کے سابق چیف جسٹس مسٹر وینکٹ چلیا (Mr. Venkatachelliah) نے کہا تھا کہ یہ (رول آف لا) کے خاتمہ کا آغاز ہے:

This is the beginning of the end.

بڑودہ یونیورسٹی میں اکنامکس ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر وی این کوٹھاری نے کہا کہ ہندستان کی مسلم کمیونٹی ایک ایسے مسئلہ سے دوچار ہے جو شاید کسی بھی دوسرے ملک کی مسلم کمیونٹی کو درپیش نہیں۔ ماضی میں وہ اس ملک میں ایک حکمراں اقلیت کی حیثیت رکھتی تھی۔ آج وہ ایک ایسی اقلیت ہے جس کو حاکمانہ حیثیت حاصل نہیں۔ مسلم جماعتیں عام طور پر اقتدار کی حیثیت میں رہی ہیں۔ ہندستان میں اس نے یہ حیثیت کھودی ہے۔ اب اس غیر حاکمانہ حیثیت کو تسلیم کرنا ان کے لئے مشکل ہورہا ہے:

The Islamic community in India faces a problem which perhaps Islamic community in no other country faces. It has been in the past a minority community in a ruling position in India. Today it is a minority community without that status. Islamic communities have been either in majority or if in minority, generally in ruling position. In India today, it is in a minority without the status of a ruling class. Acceptance of this status has been difficult for it.

بمبئی کے مسٹر اروند دیشس پانڈے نے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک پمفلٹ تقسیم کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندستان کے کمیونل مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان ہندستانی ایتھوز کو مانیں اور یہاں کے مذہب، عقائد، روایات اور ہندو ہیروؤں کا احترام کریں۔ اسی طرح ہندوؤں کو چاہئے کہ وہ قوم کو ذات، زبان، نسل، فرقہ وغیرہ سے اوپر

رکھیں :

Muslims should accept the Indian ethos and respect for the faith, beliefes, heritage and heroes of Hindus.
Hindus must put the nation above caste, language, race, sect, etc.

سیمنار میں ایک صاحب کی تقریر مجھے پسند آئی۔ وہ بڑودہ شہر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے :

G.N. Devy, Department of English
M.S. University, Baroda 390 002

انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ کانفلٹ بھی پارٹ آف لائف ہے۔ اس دنیا میں کانفلٹ فری سوسائٹی (Conflict-free society) ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں کانفلٹ کے خلاف شکایت کرنے کے بجائے کانفلٹ کے ساتھ جینے کا گر سیکھنا چاہئے

پروفیسر امریک سنگھ نے کہا کہ دو قومی نظریہ کا الزام مسٹر محمد علی جناح پر نہیں جاتا۔ کیونکہ سب سے پہلے لالہ لاجپت رائے نے ۱۹۱۶ میں یہ کہا تھا کہ ہندستان میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو، اور دوسرے مسلمان۔ تاہم یہ بات نہایت عجیب ہے کہ کیوں مسٹر جناح نے اس کی تردید نہیں کی۔ اور اس کے بجائے انھوں نے اسی کو اپنی تحریک کی بنیاد بنالیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندستان کے فرقہ وارانہ جھگڑے کی جڑ تاریخی یادیں ہیں۔ مسلمان کے دماغ میں یہ ہے کہ ہم نے ہندستان کے اوپر ایک ہزار سال تک حکومت کی ہے۔ اور ہندوؤں کے دماغ میں ہے کہ مسلمانوں نے یہاں آکر ہمیں ایک ہزار سال تک غلام بنائے رکھا۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو جھگڑے ہیں ان کو ختم کرنے کی صورت یہ ہے کہ سب کا ہیرو ایک ہوجائے۔ مسلمانوں کو ہندوؤں پر اسی طرح فخر ہونے لگے جس طرح خود ہندوؤں کو ہے۔ اس کے بغیر یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں۔

ایک سردار جی نے کہا کہ پارٹیشن نے مسلمانوں کو کچھ نہیں دیا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہاں مسلمانوں کی پوزیشن ۲۵ فیصد تھی۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد وہ کم ہوکر ۱۰ فیصد پر آگئی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایک وقت آئے گا جب مسلمانوں کو اس کا احساس ہوگا اور اس وقت یہ حال ہوگا کہ جس طرح روس میں لینن کا مجسمہ گرایا گیا

اسی طرح مسٹر جناح بھی مسلمانوں کی نظر میں حقیر ہو کر رہ جائیں گے۔

سمینار ۵ بجے شام کو ختم ہوگیا۔ اس کے بعد ہم لوگ پریانند ساہتیہ سدن کے لئے روانہ ہوئے۔ میرے علاوہ مسٹر بندوق والا، مسٹر مدھو مہتا، مسٹر اروند دیش پانڈے بھی ساتھ تھے۔ راستہ میں ملکی مسائل پر باتیں ہوتی رہیں۔

مسٹر اروند دیش پانڈے نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ سے پہلے جسٹس کھنا نے مسٹر لال کرشن آڈوانی سے کہا تھا کہ "دیکھو آڈوانی، ایسا کوئی کام نہ کرنا کہ میرے جیسے ہندو کو انڈیا میں رہتے ہوئے شرم آئے۔" مسٹر پانڈے نے بتایا کہ بھاجپا کے ایک لیڈر سے ان کی ایک گھنٹہ تک بات ہوئی۔ ان کی باتوں کا وہ جواب نہ دے سکے۔ آخر میں مسٹر اروند دیش پانڈے نے ان سے کہا: "آئندہ جب انڈیا کی ہسٹری میں آپ کا نام درج کیا جائے گا تو آپ کے خانہ میں صرف دو کارنامہ لکھا جائے گا ایک یہ کہ مہاتما گاندھی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ دوسرے یہ کہ آپ نے تاریخی بابری مسجد کو ڈھا دیا۔"

پریانند ساہتیہ سدن کے ہال میں میری تقریر کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ وسیع ہال پورا کا پورا بھرا ہوا تھا۔ نشست کا انتظام فرش پر کیا گیا تھا۔ اس جلسہ کا اعلان میرے نام کے ساتھ مقامی گجراتی اخبارات میں کر دیا گیا تھا۔ کافی لوگ اس میں شریک ہوئے۔ شرکا میں ہندوؤں کے علاوہ مسلمان بھی موجود تھے۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کو مثبت سوچنے والا (Positive thinker) بنایا جائے۔ یعنی وہ انسان جو خلاف مزاج باتوں پر نہ بھڑکے۔ جو ناموافق چیزوں کے درمیان معتدل طور پر رہ سکے۔ حتی کہ اس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ اپنے مائنس کو پلس میں تبدیل کر دے۔ تفصیلی تقریر میں مختلف مثالوں سے اس حقیقت کو واضح کیا۔

صدر جلسہ ایک مقامی ہندو تھے۔ انھوں نے آخر میں بولتے ہوئے میری تقریر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ "جب مولانا صاحب بول رہے تھے تو ایسا معلوم پڑتا تھا جیسے مہان رشی بول رہا ہے۔"

جلسہ کے بعد اسٹیج سے اترا تو مختلف لوگوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ کچھ مسلم نوجوانوں نے آٹوگراف لیا۔ ادھیڑ عمر کے ایک مسلمان جو ٹوپی پہنے ہوئے تھے اور جن کے چہرے پر داڑھی بھی تھی،

انھوں نے قریب آکر پوچھا: آپ کا رسالہ ابھی نکل رہا ہے۔ اس عجیب سوال کا میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ وہ پوچھ رہے ہوں: "آپ کی موت ابھی واقع نہیں ہوئی"۔ مذکورہ بزرگ کی طرف میں نے حیرانی کے ساتھ ایک نظر ڈالی اور پھر ان کو سلام کرکے خاموشی کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوگیا جو مجھ کو قیام گاہ لے جانے کے لئے وہاں کھڑی ہوئی تھی۔

۱۴ نومبر کی صبح کو نیند کھلی تو باہر پھیلے ہوئے درختوں کی قطاروں سے مختلف چڑیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ کوّا، کوئل اور بلبل وغیرہ۔ صبح کے سہانے میں یہ آوازیں عجیب کیفیت پیدا کررہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ خدا کے باغ میں کوّے کی کائیں کائیں بھی ہے اور بلبل کے چہچہے بھی۔ یہاں کوئل کی کوک بھی ہے اور فاختہ کی غٹرغوں بھی۔ یہ خدا کی تخلیقی اسکیم ہے۔ اب جو لوگ انسانی زندگی میں یکسانی لانے کے لئے اس کے اوپر اپنا کلچرل رولر چلانا چاہتے ہیں وہ خدا کی تخلیقی اسکیم کی نفی کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا منصوبہ فطرت کے خلاف ہے، اور جو چیز فطرت کے خلاف ہو وہ خدا کی اس دنیا میں کبھی کامیاب ہونے والی نہیں۔

۱۴ نومبر کی صبح کو ناشتہ کی میز پر پروفیسر رشید الدین خاں (جامعہ ہمدرد، نئی دہلی) کا ساتھ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ جواہر لال نہرو کو اقبال کے یہ معنی خیز اشعار بہت پسند تھے، اور وہ اکثر ان کو اپنی تقریروں میں دہرایا کرتے تھے:

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے   اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری   صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

انڈین ایکسپریس کے بڑودہ اڈیشن (۱۴ نومبر ۱۹۹۴) میں ایودھیا ورڈکٹ پر مسٹر کلدیپ نیر کا ایک مضمون چھپا ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندو یہ دعویٰ کرتے ہیں بابری مسجد کے مقام پر ایک رام مندر تھا۔ اس کو توڑ کر عین اسی مقام پر مسجد بنائی گئی۔ مسلمان اس دعویٰ کو چیلنج کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ اس حد تک گئے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ مسجد بنانے کے لئے مندر کو ڈھایا گیا تھا تو وہ خود اس کو چھوڑ دیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کون اس کو طے کرے کہ وہاں کون سی عمارت موجود تھی، مندر یا مسجد:

They (Muslims) have gone to the extent of saying that if it is proved that the temple was destroyed to raise the mosque, they would themselves disown it. Who is to decide? Which structure was there initially: temple or mosque?

مسٹر کلدیپ نیر یہاں اس واقعہ کا ذکر کرنا بھول گئے جو ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو نئی دھلی کے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں پیش آیا تھا۔ یہاں بابری مسجد اور رام مندر کے سوال پر ایک مشترکہ میٹنگ ہوئی تھی جس میں خود مسٹر کلدیپ نیر بھی موجود تھے۔ اس میں ہندو سائڈ اور مسلم سائڈ دونوں طرف کے لوگ شریک ہوئے۔ یہ بحث کلیم اور کاونٹر کلیم کی صورت میں دیر تک چلتی رہی۔ آخر میں میں نے کہا کہ اس طرح کی بحث سے تو کوئی فائدہ ہونے والا نہیں۔ درست طریقہ یہ ہے کہ ثالثی (آربٹریشن) کے اصول پر اس کو حل کیا جائے۔ میں نے کہا کہ تاریخ دانوں کا ایک بورڈ بنا دیا جائے یہ بورڈ تاریخی جائزہ لے کر جس نتیجہ تک پہنچے اس کو دونوں فریق مان لیں۔

اس تجویز سے کلدیپ نیر سمیت، شرکا کی اکثریت نے اتفاق کیا۔ قریب تھا کہ وہ اتفاق رائے سے منظور ہو جائے کہ عین اسی وقت بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے کنوینر صاحب نے باواز بلند کہنا شروع کیا کہ ہم اس تجویز کو نہیں مانتے۔ اس کے بعد انھوں نے اتنا شور مچایا کہ مزید گفتگو جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ مجلس چائے کے لئے اٹھ گئی اور کوئی بات طے نہ ہو سکی۔

میرے کمرہ میں ایک ٹی وی سیٹ رکھا ہوا تھا، مگر میں نے اس کو کبھی نہیں کھولا۔ ۱۴ نومبر کی صبح کو روانگی کے وقت تجربہ کے لئے میں نے اس کی سوئچ دبا دی تو اسکرین پر روشن حروف میں ہندی، اردو، انگریزی میں یہ الفاظ لکھ اٹھے:

نمستے جی، خوش آمدید، ہیلو۔

یہ انتظام شاید اس لئے ہوگا کہ آنے والا آدمی جب کمرہ میں داخل ہو کر اس کو کھولے تو وہ نئے آنے والے کو گیسٹ ہاؤس کی طرف سے استقبال کا کلمہ پیش کر سکے۔ مشین نے اپنا کام کیا۔ مگر مشین کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس وقت اسے اپنے مہمان کو الوداع کہنا ہے نہ کہ خوش آمدید۔

مشینی دماغ اور انسانی دماغ کا فرق یہی ہے۔ مشینی دماغ فیڈ کئے ہوئے سبق کو دہراتا ہے، جب کہ انسان خود اپنی سوچ کے تحت اپنا جواب وضع کرتا ہے۔

۱۴ نومبر کو واپسی کا دن تھا۔ صبح چائے سے فارغ ہونے کے بعد میں اور پروفیسر رشید الدین

صاحب ایک ساتھ روانہ ہوئے۔ ہماری گاڑی بڑودہ کی مختلف سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کہیں امیری کے مناظر تھے اور کہیں غریبی کے مناظر۔ میں نے سوچا کہ آدمی کا حال بڑا عجیب ہے اگر وہ غریب ہو تو پست ہمت ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ خوش حال ہو تو گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ نہ امیری میں معتدل رہتا ہے اور نہ غریبی میں۔

راستہ میں پروفیسر رشید الدین صاحب کی باتیں سنتا رہا۔ ان کی معلومات وسیع ہیں اور حافظہ بھی اچھا ہے۔ وہ چالیس سال کا تعلیمی تجربہ رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ نہایت وضع دار ہیں۔ ہم لوگ گیسٹ ہاؤس سے نکلے تو انھوں نے وہاں کے آدمی کو حسب قاعدہ ٹپ دی۔ اسی طرح ایر پورٹ پہنچے تو یہاں بھی وہ ڈرائیور کو ٹپ دینا نہیں بھولے۔

رشید الدین صاحب ۱۹۷۹ میں پاکستان گئے تھے۔ وہاں کے بارہ میں بہت سے لطیفے سناتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان میں ایک شاعر ہیں۔ ان کا تخلص فارغ ہے۔ ان کا ایک شعر رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہے۔ پاکستانی تجربہ کے بعد ہی یہ شعر نکل سکتا ہے:

اب تو یوں لگتا ہے فارغ کہ عیاذاً باللہ　　جیسے اسلام یزیدوں کے لئے آیا ہو

انھوں نے دو شعر سنایا جو ان کے الفاظ میں گویا اس ملک میں اردو اور مسلمان دونوں کی کہانی کا خلاصہ ہے۔ ۱۹۰۵ میں داغ دہلوی نے فخر کے ساتھ کہا تھا:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ　　ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

آج کیا حال ہے، اس کا اظہار مجروح سلطانپوری کے ایک شعر سے ہوتا ہے۔ ان کی ایک نظم کا یہ شعر اردو زبان کی موجودہ حالت کی تصویر ہے:

زباں ہماری نہ سمجھا یہاں کوئی مجروح　　ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

ایک اور شعر انھوں نے شاہد صدیقی کا سنایا۔ وہ حیدر آبادی تھے اور جگر مراد آبادی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنی ایک نظم میں کہا:

مجھے رہبروں سے ہے یہ گلہ کہ انھیں شعور سفر نہ تھا　　کبھی راستوں میں الجھ گئے کبھی منزلوں سے گزر گئے

اس طرح بات کرتے ہوئے ہم لوگ ایر پورٹ پہنچ گئے۔ بڑودہ سے انڈین ایر لائنز کی فلائٹ ۸۱۷ کے ذریعہ دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ ایک ہی پرواز ہے جو دہلی۔ احمد آباد۔ بڑودہ۔ دہلی کے درمیان

روزانہ چلتی ہے۔

راستہ میں انڈین ایرلائنز کی فلائٹ میگزین سواگت (نومبر ۱۹۹۴) دیکھا۔ اس کے ہندی حصہ میں پہلا مضمون تھا ——— مہان صوفی سنت، حضرت نظام الدین اولیاء۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ دہلی کی مرکزی حکومت میں جو شخص بھی پرائم منسٹر بنتا ہے، وہ درگاہ نظام الدین جاکر وہاں چادر ضرور چڑھاتا ہے۔ کیوں کہ عام عقیدہ یہ ہے کہ حضرت نظام الدین کی مرضی کے بغیر کوئی شخص دہلی پر حکومت نہیں کرسکتا۔ چنانچہ وہ سلطان جی کہے جاتے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء ۱۲۳۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ انھوں نے سب کو ہمیشہ مانو پریم کا سندیش دیا (صفحہ ۲۹)

انگریزی میں ایک مضمون مسٹر ہومی جے وکیل کے قلم سے تھا، اس کی تصویریں مسٹر وی بالو نے فراہم کی تھیں۔ اس کا موضوع تھا تلاش امن:

In search of Peace

اس مضمون میں اقوام متحدہ کے ادارۂ امن کے لٹریچر سے ایک جملہ نقل کیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا ہے کہ چوں کہ جنگیں لوگوں کے دماغ میں شروع ہوتی ہیں، اس لئے انسانی دماغ ہی سے ہمیں امن قائم کرنے کی کوششوں کا آغاز کرنا چاہئے:

Since wars begin in the minds of men, it is there that we must begin to construct the defences of peace. (p. 12)

پرامن سماج بنانے کا ذریعہ پرامن انسان بنانا ہے۔ جب تک پرامن سوچ والے انسان وجود میں نہ آئیں پرامن سماج کا وجود بھی ممکن نہیں۔

۱۴ نومبر ۱۹۹۴ کی دوپہر کو جہاز دہلی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ میں جہاں سے چلا تھا وہیں دوبارہ واپس آگیا۔ یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ آدمی آخرت سے نکل کر دنیا میں آتا ہے اور دوبارہ پھر وہ آخرت کی طرف واپس چلا جاتا ہے۔ دنیا میں ہماری واپسی پردیس سے گھر کی طرف ہوتی ہے، آخرت میں ہماری واپسی عمل کی دنیا سے انجام کی دنیا کی طرف ہوگی۔

واپسی کے بعد بڑودہ سے چند خطوط ملے۔ مسز الکنندا پٹیل (Tel. 0265-339026) جو سمینار

کی آرگنائزر تھیں، ان کے خط مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۹۴ کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو میں اپنا خط لکھنے کی کوشش کی۔ پہلی سطر میں لکھا "عزیز مولانا صاحب، آداب" اس کے بعد اس طرح انگریزی میں شروع کیا:

Unfortunately, my Urdu writing does not go beyond this. So I will continue in English. It is difficult for me to express how grateful we are that you came for the seminar last Sunday. For all of us it was a special blessing and I would not belittle the experience of hearing you and being with you by trying to thank. Both the Rajiv Gandhi Institute and we in Baroda are very keen that a volume containing a few papers and the proceedings should come out soon. It will be wonderful for us if you write a piece, even a short one. An article from you will mean so much.

گوہاٹی کا سفر

گوہاٹی (آسام) میں ۳ - ٦ جنوری ۱۹۹۵ کو ایک نیشنل سیمنار ہوا۔ اس کی دعوت پر گوہاٹی کا سفر ہوا۔ اس سیمنار کا موضوع تھا ـــــ نارتھ ایسٹ انڈیا اور اکیسویں صدی:

North-east India and the 21st century.

آج گوہاٹی کے لئے روانگی کا دن تھا۔ میں تیاری میں مصروف تھا۔ دو صاحبان ملاقات کے لئے آگئے۔ دونوں پڑھے لکھے اور دیندار مسلمان تھے۔ دونوں نے کہا کہ ہم کو آپ کے مشن سے اختلاف ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا اختلاف ہے۔ ایک نے کہا کہ آپ ہمارے اکابر پر تنقید کرتے ہیں۔ دوسرے نے کہا کہ آپ ہندؤوں کے مقابلہ میں صبر کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ اس وقت میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں آپ دونوں سے صرف ایک بات کہتا ہوں۔ آج رات کو جب آپ بستر پر سونے کے لئے جائیں تو یہ سوچیں کہ کل اگر آپ کی موت ہو جائے اور خدا آپ سے پوچھے کہ تم الرسالہ مشن کے مخالف کیوں بن گئے تھے۔ تو کیا آپ کا یہ جواب وہاں کام آئے گا کہ ہم اس لئے مخالف ہو گئے کہ یہ شخص ان لوگوں پر تنقید کرتا تھا جس کو ہم نے بطور خود اکابر کا درجہ دے رکھا تھا۔ اور وہ ہندؤوں سے صبر کرنے کے لئے کہتا تھا جن کو ہم اپنا قومی دشمن بنائے ہوئے تھے۔

جنوری ۱۹۹۵ کی دو تاریخ ہے اور صبح ساڑھے گیارہ بجے کا وقت۔ میں دہلی ایرپورٹ پر گوہاٹی جانے والے جہاز کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ نشست گاہ میں نسبتاً کم آدمی نظر آرہے ہیں۔ تاہم تقریباً ہر آدمی کے ہاتھ میں آج کا اخبار ہے۔ اخبار کیا ہے۔ خارجی دنیا کا خبرنامہ۔ میں نے سوچا: ہر آدمی دوسروں کا خبرنامہ پڑھ رہا ہے۔ خود اپنا خبرنامہ پڑھنے کا شوق کسی کو نہیں۔

کچھ دیر میں گیٹ پر روشن حروف میں یہ الفاظ نمایاں ہو گئے (Now Boarding—889)

یہ اس بات کا خاموش اعلان تھا کہ گوہاٹی جانے والا جہاز روانگی کے لئے تیار ہے۔ مسافر ایک ایک کرکے گیٹ سے گزر کر انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۸۸۹ میں داخل ہو گئے۔

جہاز کسی قدر تاخیر کے ساتھ روانہ ہوا۔ دہلی سے گوہاٹی کے لئے یہ سوا دو گھنٹہ کی نان

اسٹاپ فلائٹ تھی۔ ایئر پورٹ پر یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جہاز ٹھیک وقت سے گوہاٹی کے لئے روانہ ہوگا۔ مگر جب تمام مسافر جہاز کے اندر بیٹھ گئے تو معلوم ہوا کہ کچھ ٹکنکل سبب کے تحت جہاز لیٹ ہے۔ چنانچہ ۴۵ منٹ کی تاخیر کے ساتھ جہاز پونے ایک بجے روانہ ہوا۔

میں نے سوچا کہ ہندستان میں آدمی خواہ ہوائی جہاز سے سفر کرے یا ٹرین کے ذریعہ، ہر جگہ ناقابل قیاس مسائل ہیں۔ کل دہلی ریلوے اسٹیشن پر ایک ناقابل ذکر واقعہ پیش آیا۔ ہمارے دفتر کے ایک کارکن نصیر احمد صاحب کے بوڑھے والد اپنے بیٹے سے مل کر واپس اپنے وطن یوپی جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک نیا سوٹ کیس تھا جس میں کچھ نئے کپڑے اور کھانے کا سامان تھا۔ بزرگ پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے بیٹے سیٹ دیکھنے کے لئے گاڑی میں گئے تھے۔ اتنے میں ایک آدمی آیا۔ اس نے کہا: بڑے میاں چلئے آپ کو گاڑی میں بٹھا دیں۔ یہ کہہ کر فوراً اس نے بیگ اٹھایا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ بڑے میاں کہتے رہے کہ میرے ساتھ میرا لڑکا ہے۔ مجھے ضرورت نہیں۔ مگر وہ آدمی تیزی سے بیگ لے کر غائب ہوگیا۔

اس قسم کے جرائم ہر روز ہر بستی اور ہر شہر میں ہو رہے ہیں۔ ان کے مسلسل جاری رہنے کا واحد سبب یہ ہے کہ مجرمین کو یہ اطمینان رہتا ہے کہ انھیں کوئی سزا ملنے والی نہیں۔ اگر انھیں یقین ہو کہ جرم کرنے پر مجھے کوڑا مارا جائے گا، میرا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا، مجھے گولی مار دی جائے گی، تو جرائم اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

پرواز کے دوران ۲ جنوری کے اخبارات ہندو، بزنس لائن، دی آبزرور پڑھا۔ مگر ان میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ملی۔ ہندستان کے اخبارات پر سیاسی ذوق اتنا زیادہ چھایا ہوا ہے کہ میرے جیسے آدمی کو کوئی کام کی بات مشکل ہی سے ملتی ہے۔ مغربی ملکوں میں ایسا نہیں ہے۔ مگر وہاں بھی صرف یہ فرق ہوا ہے کہ اخباروں کے صفحات پر سیاست کی جگہ تجارت نے قبضہ کر لیا ہے۔

انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ میگزین سواگت کا شمارہ جنوری ۱۹۹۵ دیکھا۔ اس میں ایک مضمون ہندستان کی سیاحت پر تھا جو مارک نکلس (Mark Nicholls) کے قلم سے تھا۔ وہ بذریعہ ٹرین مختلف مقامات کا سفر کرتا ہوا آگرہ پہنچتا ہے۔ وہاں وہ تاج محل کو دیکھتا ہے۔ تاج محل کو وہ عجوبۂ عالم (Wonder of the World) قرار دیتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اگر کسی ایک بلڈنگ کو انڈیا

کی علامتی تصویر بتانا ہو تو وہ ممتاز محل کا مقبرہ (تاج محل) ہے:

If one building was to sum up an image of India it is the tomb of Mumtaz Mahal. (p. 74)

لوگ تاج محل کو غیر معمولی اہمیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مگر تقریباً ۲۵ سال پہلے جب میں پہلی بار آگرہ گیا اور تاج محل کو دیکھا تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی۔ میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر قریب کی مسجد میں چلا گیا۔

۲ جنوری کی سہ پہر کو ۳ بجے جہاز گوہاٹی ایرپورٹ پر اتر گیا۔ یہاں ایرپورٹ کے لاؤنج میں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھنا پڑا۔ یہاں ایک معمر بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ یہ پروفیسر بی کے رائے برمن تھے۔ وہ دہلی میں رہتے ہیں (Tel. 641194) انھوں نے بتایا کہ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں پر کئی کتابیں انگریزی میں لکھی ہیں۔ ان کی دو کتابوں کے نام یہ ہیں:

Prism in Islam
Muharram in two cities
by B.K. Roy Burman
1779, C.R. Park, New Delhi

میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ مختصر طور پر بتائیں گے کہ آپ کے مطالعہ کے مطابق اسلام کی اسپرٹ کیا ہے۔ انھوں نے حسب ذیل الفاظ میں اپنا تاثر بیان کیا:

Human brotherhood, man's basic nature is in quest of his humane essence, social justice.

پروفیسر رائے برمن نے کثرت سے ملک کے مختلف حصوں کا سفر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان مختلف اور متضاد کلچروں کا ملک ہے۔ انھوں نے بتایا کہ گوہاٹی سے ۶۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ایک مندر ہے۔ وہاں سال میں ایک دن باجماعت نماز ہوتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے بتایا کہ بھوٹان کی سرحد پر ایک قبیلہ ہے۔ وہ اپنے دیوتا کو خوش کرنے کے لئے سال میں ایک دن گائے کی قربانی کرتا ہے۔ اس طرح کی مختلف باتیں انھوں نے بتائیں۔

ایرپورٹ سے ہوٹل کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ تقریباً پون گھنٹہ کا راستہ تھا۔ راستہ

میں سڑک کے دونوں طرف گوہاٹی کے مناظر سامنے سے گزرتے رہے۔ ہر چیز پر پسماندگی کے آثار دکھائی دئے۔ یہاں کے مکانات، یہاں کی دکانیں، یہاں کے مرد اور عورت، سب کچھ کم (Miniature) سے دکھائی دئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ہر چیز پر پسماندگی کی اسٹیمپ لگی ہوئی ہے۔

ایک آدمی جب دہلی کو دیکھتا ہے تو وہ اس کو پرعظمت شہر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ گوہاٹی کو دیکھتا ہے تو گوہاٹی اس کو مقابلۃً نمبر ۲ کا شہر معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ فرق اس کے اندر وہ احساس جگاتا ہے جس کو "علیحدگی پسندی" کہا جاتا ہے۔ ہندستان کی یہی نامساوی ترقی یہاں کی سیاسی بے چینی کی اصل ذمہ دار ہے۔ اس کے برعکس آپ امریکہ میں جائیں یا یورپ کے کسی ترقی یافتہ ملک کا سفر کریں تو وہاں بڑے شہر اور چھوٹے شہر میں اس قسم کا فرق آپ کو نہیں ملے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں ہمارے ملک جیسی علیحدگی کی تحریکیں بھی ابھرنے نہیں پاتیں۔

گوہاٹی میں میرا قیام اشوک گروپ کے ہوٹل برھم پترا کے کمرہ ۳۰۱ میں تھا۔ ہوٹل کے کمرہ میں پشت کی طرف "شیشہ کی دیوار" کے باہر سبزہ اور درخت کے مناظر ہیں۔ اس کے بعد جھیل ہے جس کا پانی دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے اوپر چڑیوں کے جھنڈ اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جھیل کے اس پار سبز پوش پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں۔

یہ مناظر بتاتے ہیں کہ یہ علاقہ قدرتی وسائل سے بھرا ہوا ہے۔ خاص طور پر یہاں پانی کی افراط ہے جس سے زراعت اور باغبانی کو بہت ترقی دی جاسکتی ہے۔ نیز، سستی بجلی بڑی مقدار میں پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس کے باوجود یہ علاقہ پسماندہ پڑا ہوا ہے۔ ایک ریٹائرڈ افسر نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حکومت نے اس علاقہ کی مدد نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ مرکزی حکومت نے اس علاقہ کو بے پناہ مالی مدد بھیجی ہے۔ مگر اس مدد کا بڑا حصہ تھوڑے سے لوگوں کی جیب میں چلا گیا۔ اس کا بہت کم حصہ ڈیولپمنٹ کے کاموں میں استعمال ہوا۔ ہندستان میں آپ جس مسئلہ کی تحقیق کریں، آخر میں سب کی جڑ میں یہی کرپشن نظر آئے گا۔

اس صورت حال کی بنا پر اب میرا حال یہ ہے کہ حکومت جب "ڈولپمنٹ" کے نام پر کسی بڑی رقم کا اعلان کرتی ہے تو میری روح کانپ اٹھتی ہے کہ عوامی ٹیکسوں پر لوٹ کی ایک نئی مد کھل گئی۔

۲ جنوری کی شام کو میں اپنے کمرہ میں تھا کہ داخلی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی کہ جسٹس بھاگوتی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ان سے گفتگو ہوئی۔ وہ بھی سمینار میں آئے ہوئے ہیں اور اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ ضرور تشریف لائیں۔ چند منٹ کے بعد وہ کمرہ میں آگئے۔

جسٹس پی این بھاگوتی (سابق چیف جسٹس آف انڈیا) انٹرنیشنل شہرت کے آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں سے واپسی کے بعد میں اریٹریا جارہا ہوں۔ وہاں کی حکومت نے اپنے دستور کا ڈرافٹ تیار کرنے کے لئے مجھے بلایا ہے۔ وہاں سے واپسی کے بعد میں دہلی میں آپ سے تفصیلی ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ گفتگو کے بعد ۱۵ جنوری کی تاریخ طے ہوئی۔ میں نے تجویز کیا کہ دہلی میں کچھ معروف افراد پر مشتمل ایک حلقہ بنایا جائے۔ اس کی ماہانہ میٹنگ ہوا کرے۔ دوسرے کاموں کے علاوہ اس کا ایک خاص کام یہ ہو کہ پیش آمدہ اشوز پر وہ تبادلہ خیال کے بعد ایک اسٹیٹمنٹ تیار کرے اور فوری طور پر اس کو اخبارات میں شائع کرایا جائے۔ انھوں نے اس سے مکمل اتفاق کیا۔ اور کہا کہ میں سفر سے واپسی کے بعد ۱۵ جنوری تک آپ سے ملوں گا اور اس تجویز کو عملی شکل دینے کے لئے گفتگو کروں گا۔

آج شام کو مغرب کی نماز ہوٹل کے کمرہ میں پڑھی۔ نماز کے بعد ہاتھ اٹھایا تو یہ دعا زبان سے نکلی: اللّٰهم ادخلني مدخل صدق و اخرجني مخرج صدق و اجعل لي من لدنك سلطاناً نصيراً

۲ جنوری کی شام کو ۸ بجے ایک ہال میں تفریحی پروگرام تھا۔ لوگ اس کو دیکھ کر محظوظ ہورہے تھے۔ میں رنج وغم میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے قرآن کی آیت (الجمعہ ۱۱) یاد آئی۔ میں نے سوچا کہ آج کی دنیا میں آدھے انسان لہو میں مبتلا ہیں۔ اور آدھے انسان تجارت میں۔ ذکر خداوندی میں مشغول ہونے والا انسان کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

اس سے واپسی میں مسٹر چترنجن ڈیب سے ملاقات ہوئی۔ وہ اگرتلا کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۴۶ میں جب گاندھی جی نواکھالی گئے تھے تو وہ وہاں جاکر گاندھی جی سے ملے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اس وقت میری عمر ۱۶ سال تھی۔ میں نے گاندھی جی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا تو گاندھی جی

ہنس پڑے۔ یہ ہنسی غضب کی تھی۔ وہ آدمی کو مسحور کردینے والی تھی۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ سرونسٹن چرچل نے کیوں اپنے لڑکے سے کہا تھا کہ اس ننگے فقیر سے (naked Fakir) مت ملنا۔ اس کی ہنسی تم کو کھا جائے گی۔

اشوک ہوٹل میں مولانا اسعد مدنی کے صاحبزادہ جناب محمود اسعد مدنی (۲۸ سال) سے ملاقات ہوئی۔ وہ بزنس کے سلسلہ میں یہاں آئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جب میں دارالعلوم میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، اس وقت سے میرے اندر تجارت کا جذبہ پیدا ہوا۔ لوگوں سے سنتا تھا کہ چندہ لے کر کھا گئے تو میں نے طے کیا کہ میں بزنس کروں گا۔ چنانچہ انھوں نے لکڑی کی تجارت شروع کی ہے۔ ٹیک کی لکڑی وہ آسام سے خرید کر لے جاتے ہیں اور لکھنؤ میں ہول سیل میں اس کو فروخت کرتے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ عام طور پر علماء کے خاندان کے لوگ مدرسہ اور چندہ کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ آپ نے اس کے بجائے تجارت کا کام شروع کرکے ایک مثال قائم کی ہے۔

مولانا محمود اسعد مدنی سے میں نے کہا کہ میں گوہاٹی کے کچھ مسلمانوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کچھ مقامی مسلمانوں سے ربط قائم کیا۔ چنانچہ ۵ جنوری کو نماز مغرب کے بعد کچھ لوگ آگئے۔ ہوٹل کے کمرہ میں نشست ہوئی۔ ان میں جمیل الدین احمد صاحب، رقیب الحسین صاحب آصف احمد صاحب، علی رضا صاحب، غلام اکبر صاحب وغیرہ موجود تھے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی اس نشست میں گوہاٹی اور آسام کے مسلمانوں کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ آسام میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۳۰ فیصد ہے اور گوہاٹی میں تقریباً پندرہ فیصد۔ گوہاٹی شہر میں تقریباً ایک سو مسجدیں ہیں۔ بہت سے مدرسے قائم ہیں۔ ایک بڑا مدرسہ جس میں دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ تاہم پورے آسام میں مسلمانوں کا کوئی اخبار موجود نہیں۔ روایتی طور پر آسام میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بہت اچھے رہے ہیں۔ مگر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد یہاں کے کچھ مسلمانوں نے انتہائی نادانی سے کام لیتے ہوئے اجودھیا کا غصہ آسام میں اتارنا چاہا۔ اس کے نتیجہ میں تعلقات میں کچھ بگاڑ آگیا۔

۴ جنوری کی صبح کو ناشتہ کی میز پر کئی آدمیوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک مسٹر رو ندر کیلے کر (Ravindra Kelekar) ہیں۔ ان کی عمر ۷۰ سال ہے اور وہ گوا کے رہنے والے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ اپنی زندگی کا کوئی خاص واقعہ بتائیے۔

انھوں نے ۱۹۵۳ کا ایک واقعہ بتایا۔ اس وقت وہ واردھا (سیوا گرام) میں تھے۔ وہاں سے گجراتی زبان میں ایک پرچہ نکلتا تھا جس کا نام منگل پربھات تھا۔ اس پر اڈیٹر کی حیثیت سے کا کا صاحب کالیلکر کا نام ہوتا تھا۔ مگر عملاً اس کو رویندر کیلے کر ہی مرتب کرتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ انھوں نے سنسکرت کا ایک اشلوک گجراتی میں نقل کیا تو سنسکرت میں زیادہ واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے اس کو انھوں نے غلط طور پر لکھ دیا تھا۔ لوگوں نے کا کا صاحب کالیلکر کو توجہ دلائی تو انھوں نے رو ندر کیلے کر کو ایک خط لکھا تھا کہ تم سنسکرت کے اشلوک غلط لکھتے ہو، اس طرح تو میری بدنامی ہو جائے گی۔ اس کے جواب میں رو ندر کیلے کر نے انھیں لکھا کہ اس کا حل یہ ہے کہ پرچہ میں میرا نام ورکنگ اڈیٹر کے طور پر لکھ دیا جائے۔ اس طرح اس قسم کی غلطیاں میرے خانہ میں چلی جائیں گی۔ اور آپ کی بدنامی نہیں ہوگی۔

کا کا صاحب کالیلکر (وفات ۱۹۸۱) نے جواب میں لکھا کہ ایسا کرنا تمہارے حق میں اچھا نہیں ہے۔ جب تک تم تیاری کے مرحلہ میں ہو تب تک تمہاری غلطیاں مجھے لینا چاہئے۔ اس وقت تم کو بدنامی سے بچانا زیادہ ضروری ہے تاکہ تمہارا صحافتی مستقبل خراب نہ ہونے پائے۔

۳ جنوری کو سمینار کا افتتاح تھا۔ ہم لوگ ہوٹل سے رابندر بھون لے جائے گئے۔ گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو دو درجن کی تعداد میں ناگا لوگ استقبال کے لئے موجود تھے۔ وہ اپنے روایتی لباس میں تھے۔ روایتی انداز کا نیم برہنہ لباس ان کے جسم پر تھا۔ ہاتھوں میں بلم لئے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی زبان میں ایک گانا گایا جو سمجھ میں نہ آسکا۔ اس کے بعد مہمانوں کو دونوں طرف سے اپنے جلو میں لے کر اندر ہال میں لے گئے۔ یہاں دوبارہ وہ لوگ اسٹیج کے پیچھے اپنے روایتی اسلحہ کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

مسٹر نٹور ٹھکر جو اسی علاقہ کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ ناگا لوگ ہیں۔ ان کا کلچر جنگ پر مبنی ہے۔ ان کا پورا کلچر وار کلچر ہے۔ آج کی تقریب میں انھوں نے فتح کا منظر دکھایا تھا، جیسے

کہ ہم نے اس شہر کو فتح کیا ہے ۔اور اب فتح کی تقریب منانے کے لئے ہم اس ہال میں آئے ہیں اور فوجی دستے ہمارے ساتھ ہیں۔

مسٹر نٹور ٹھکر نے اپنے ویلکم ایڈریس میں کہا کہ جواہر لال نہرو کہتے تھے کہ ہم سب چھوٹے لوگ ہیں جو ایک بڑے کام میں مشغول ہیں :

We all are small men engaged in great mission.

میں نے سوچا کہ یہ بات تو بڑی اچھی ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ سو سالہ محنت کے باوجود ہماری کوششوں کا رزلٹ کیوں نہیں نکل رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک الٹی جانب سفر کر رہا ہو۔

جسٹس پی این بھاگوتی نے اپنے افتتاحی ایڈریس میں دہرایا کہ نہرو نے کہا تھا کہ اپنی کامیابی کو جانچنا ہو تو ملک کے سب سے چھوٹے آدمی کو دیکھو :

...see the smallest man of India.

یہ سمینار ناگالینڈ گاندھی آشرم کے زیر انتظام منعقد کیا گیا تھا۔ سابق چیف جسٹس آف انڈیا پی این بھاگوتی نے اس کا افتتاح کیا۔ اپنے اختتامی خطاب میں انھوں نے کہا کہ اس علاقہ میں علیحدگی کا جو طاقت ور رجحان پایا جاتا ہے، اس کا واحد حل یہ ہے کہ مرکز کا اقتدار اسٹیٹ کے اوپر سے کم کیا جائے۔ غیر مرکزی نظام ہی اس کا واحد حل ہے :

the only solution is decentralisation of power.

چند اور تقریریں ہوئیں۔ مقامی انگلش اخبار کے اڈیٹر ڈاکٹر بیزبورہ (D.N. Bezboruah) نے کہا کہ اکیسویں صدی میں ہمارے ملک میں کوئی معجزہ ہونے والا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں کا آدمی صرف اپنے حقوق کو جانتا ہے۔ اس کو ملک کے بارہ میں اپنی ذمہ داریوں کا پتہ نہیں :

No miracle was going to happen in the 21st century in the country. This was due to our obsession with our rights rather than duties to our country.

افتتاحی اجلاس ۳ جنوری کو راج بھون میں ہوا تھا۔ بقیہ تمام اجلاس ہوٹل برہم پتر

اشوک کے ہال میں ہوئے۔ مقررین نے بہت سی باتیں کہیں۔ ساری باتیں نقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ چند باتیں متفرق طور پر یہاں درج کی جاتی ہیں :

ایک صاحب نے گاندھی جی کا یہ قول دہرایا کہ "سارے مذہب اچھے ہیں، سارے مذہب سچے ہیں، مگر سارے مذہب کچے ہیں"۔ یہ بات کہنے میں بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر وہ غیر منطقی ہے۔ سچائی کو آدمی اس لئے اختیار کرتا ہے تاکہ وہ اعتقادی یقین حاصل کر سکے۔ مگر مذکورہ فارمولا آدمی کو ہمیشہ کے لئے یقین سے محروم کر دیتا ہے۔ ایسا فارمولا تلاش حق کے جذبہ کے مطابق نہیں۔ اس لئے وہ صحیح بھی نہیں ہو سکتا۔

ایک صاحب نے کہا کہ جو لوگ انگریزی زبان کو ختم کرنے کی بات کرتے ہیں ان کو جاننا چاہئے کہ موجودہ حالات میں وہ ممکن نہیں۔ لوگ انگریزی زبان کی طرف کیوں جاتے ہیں۔ وہ تین باتوں کے لئے ایسا کرتے ہیں ــــــ پاور، رسپکٹ، جاب۔ یہ تینوں باتیں جب تک آپ ملکی زبان میں پیدا نہ کر سکیں، انگریزی کی طرف دوڑ بھی ختم ہونے والی نہیں۔

مسٹر دوارکا شرما نے بتایا کہ میزورم میں ایک نوجوان سے انھوں نے پوچھا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ نوجوان نے جواب دیا کہ ہم انڈیا سے الگ ہونا چاہتے ہیں۔ انھوں نے دوبارہ پوچھا کہ کیوں۔ نوجوان نے جواب دیا کہ وہ ہمارے ساتھ برابر کا سلوک نہیں کرتے :

They are not treating us as equal.

ایک صاحب نے کہا کہ ان نوجوانوں میں گھومنے کے بعد میں سمجھا ہوں کہ ان کے نزدیک پرامن ذرائع کا وقت اب ختم ہو چکا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب وہ ہتھیار کے سوا کوئی اور بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ نوجوان مایوس ہیں، اور یہی اصل مسئلہ ہے :

Youths are disillusioned, this is the problem.

۳ جنوری کو دوپہر بعد کے سیشن میں ہیومن رائٹس کے مسئلہ پر غور ہوا۔ یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اس علاقہ میں عوام کے اندر جو بے چینی ہے اس کی وجہ کیا یہ ہے کہ ان کے حقوق انسانی کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں دو قسم کی باتیں سامنے آئیں۔ میری رائے یہ تھی کہ اصل مسئلہ بے شعوری کا ہے نہ کہ حقوق انسانی کی خلاف ورزی کا۔

۴ جنوری کو تیسرا اجلاس ساڑھے نو بجے صبح شروع ہوا۔ آج بھی حقوق انسانی کا مسئلہ دوبارہ زیر بحث آیا۔ سرکاری افسروں کا خیال تھا کہ گورنمنٹ بہت کام (tremendous work) کر رہی ہے۔ تحفظ حقوق کا قانون (Protection of human rights act) بنایا گیا ہے۔ ہیومن رائٹس کمیشن بنایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں کا نیشنل رجسٹر بنایا گیا۔ کمیشن کے نام چار ہزار شکایتیں حقوق انسانی کی خلاف ورزی کی وصول ہوئیں۔ وغیرہ۔

ایک اہم مثال یہ ہے کہ کمیشن نے تجویز کیا کہ ٹاڈا پر نظر ثانی کی جائے۔ اسی طرح جیل کا معائنہ کرکے تجویز کیا کہ قیدیوں کی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ مثلاً جیل میں جگہ کی تنگی (over crowding in jails) وغیرہ۔

میں نے کہا کہ حقوق انسانی کے جو واقعات اخباروں میں چھپتے ہیں وہی مجالس میں زیر بحث آتے ہیں۔ حالانکہ وہ کل ہونے والے واقعات کا بمشکل ۵ فیصد حصہ ہوتا ہے۔

۳ جنوری کی شام کو میں پروگرام سے فارغ ہو کر ہوٹل واپس آ رہا تھا۔ گاڑی میں میرے علاوہ دو اور صاحبان تھے۔ دونوں دو الگ الگ یونیورسٹیوں کے پروفیسر تھے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا: آپ کی یونیورسٹی میں کوئی پرابلم تو نہیں۔ انھوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ جس یونیورسٹی میں پرابلم نہ ہو وہ یونیورسٹی ہی نہیں:

University minus of problems is not a university.

یہ حال اب ہمارے ملک میں تعلیمی اداروں کا ہو چکا ہے۔ اب تعلیمی اداروں میں تعلیم سے زیادہ سیاست کی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ سیاسی سرگرمیوں کے لئے جو اشو استعمال کئے جاتے ہیں انھیں کا نام پرابلم ہے۔ ہماری تعلیم گاہوں کا یہ حال کیوں ہے۔ اس کا سبب بہت پیچھے تک جاتا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے زمانہ میں تعلیم گاہوں میں سیاست داخل کی گئی تاکہ آزادی کی تحریک کے حق میں نوجوانوں کی تائید حاصل کی جاسکے۔ ۱۹۴۷ کے بعد دوبارہ یہ سیاست جاری رکھی گئی کیونکہ نئے حکمرانوں کو الکشن میں ووٹ حاصل کرنے کے لئے طلبہ کی مدد کی ضرورت تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار تعلیمی ادارے تعلیم سے زیادہ سیاست بازی کا مرکز بن گئے۔
اس علاقہ کی سات ریاستوں میں تعلیم کی حالت کیا ہے، اس کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے ہوگا:

Percentage of literacy to total population 1981 & 1991

States	1981			1991		
	Average	Male	Female	Average	Male	Female
Arunachal Pr.	20.70	28.94	11.32	41.22	51.20	29.37
Assam	—	—	—	53.42	62.34	43.70
Manipur	41.35	53.29	29.06	60.96	72.98	48.64
Meghalaya	34.08	37.89	30.08	48.26	51.57	44.78
Mizoram	50.88	64.46	54.91	81.23	84.06	78.09
Nagaland	42.57	50.06	33.89	61.30	66.09	55.72
Tripura	42.12	51.70	32.00	60.39	70.08	50.01
India	43.56	56.37	29.75	52.11	63.86	39.42

ایک مقامی بزرگ نے بڑے دردمندانہ انداز میں اس علاقہ کے حالات بتائے۔
انھوں نے کہا کہ علیحدگی کی تحریک میں ہم نے اپنا سب کچھ کھو دیا، اور پایا کچھ بھی نہیں۔ نئی دہلی کے لوگوں سے کہئے کہ وہ کوئی موثر ڈائیلاگ شروع کریں، اور یہ ڈائیلاگ کسی پیشگی شرط (pre-condition) کے بغیر ہو۔ نارتھ ایسٹ کا یہ علاقہ جلنے کے لئے نہیں ہے:

The North-East is not for burning.

میں نے کہا کہ یہ سارا معاملہ غیر حقیقت پسندانہ انداز اختیار کرنے کی وجہ سے پیش آیا ہے۔ اور اب حقیقت پسندی کا طریقہ کرکے ہم اس کو ختم کر سکتے ہیں۔
گوہاٹی کو اگرچہ دوسرے ہندستانی شہروں کے مقابلہ میں ایک بی کلاس سٹی کا درجہ حاصل ہے۔ مگر اس کی اہمیت اس اعتبار سے بہت زیادہ ہے کہ وہ پورے نارتھ ایسٹرن علاقہ کے لئے ہندستانی دروازہ کی حیثیت رکھتا ہے:

Gauhati is the gateway to the entire north-eastern region.

نارتھ ایسٹ انڈیا کا علاقہ اپنی مخصوص جغرافی پوزیشن کی وجہ سے مرغ کی گردن

(chicken's neck) کہا جاتا ہے۔ ذیل کے نقشہ سے اس کا اندازہ ہوگا:

سیمنار میں جو کاغذات تقسیم کئے گئے ان میں کچھ معلوماتی صفحات تھے۔ ان میں سے ایک میں بتایا گیا تھا کہ ان ساتوں ریاستوں میں مذہب کے اعتبار سے آبادی کا تناسب کیا ہے، یہ اعداد وشمار اگلے صفحہ پر نیچے نقل کئے جا رہے ہیں۔

واضح ہو کہ ہندستان میں اس وقت چھ بڑے مذاہب پائے جاتے ہیں۔ وہ یہ ہیں —— ہندوازم، اسلام، مسیحیت، سکھ ازم، بدھزم، جین ازم، آبادی کے اعتبار سے ان مذاہب کا تناسب یہ ہے:

(1) Hindu 76.4%
(2) Islam 12.6%
(3) Christian 7.3%
(4) Jaina 2.2%
(5) Buddhist 2%
(6) Sikh 2.8%

مسٹر نٹور ٹھکر مشنری انسان کا کامیاب نمونہ ہیں۔ انھوں نے نیشنل انٹگریشن کا مشن لیکر ۱۹۵۵ میں ناگا پہاڑیوں میں گاندھی آشرم بنایا۔ اس وقت سے اب تک ہر قسم کی مشکلات کے باوجود وہ اس ایک مقصد کے تحت یہاں جمے ہوئے ہیں۔ ایک ایسا علاقہ جہاں علیحدگی کی تحریک جارحانہ بنیاد پر چل رہی تھی، وہاں انھوں نے ملکی اتحاد کے لئے خاموش محنت شروع کی۔ ان پر کئی بار قاتلانہ حملے کئے گئے، مگر آج وہ ناگاؤں کے درمیان ایک محبوب شخصیت ہیں۔ انھوں نے اپنے مقصد میں قابل لحاظ کامیابی حاصل کی ہے۔

یہ کامیابی انھیں کیسے ملی۔ اس کے لئے سب سے پہلے انھوں نے یہ کیا کہ یہاں آنے کے بعد انھوں نے پوری طرح ناگا کلچر کو اختیار کر لیا۔ وہ انھیں میں کے ایک فرد بن گئے۔ وہ نہایت سخت قسم کے سبزی خور ہیں اور پورے معنوں میں گاندھی وادی ہیں۔ مگر یہاں انھوں نے دیکھا کہ گوشت ناگاؤں کی روزمرہ کی غذا ہے۔ ایسی حالت میں سبزی خوری کی عادت کو لے کر وہ ناگاؤں میں گھل مل نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے مقصد کی خاطر گوشت خور (non-vegetarian) بن گئے۔ انھوں نے اپنا قصہ بتاتے ہوئے کہا:

Distribution of Religion in North Eastern State (in percentage)

States	Hinduism	Islam	Christ.	Sikh	Buddhists	Jains	Others
Arunachal Pr.							
Assam*	58.57	24.28	6.3	0.12	0.43	0.12	0.03
Manipur	60.04	6.99	29.6	0.06	0.03	0.06	3.15
Meghalaya	18.02	3.10	52.6	0.12	0.20	0.04	25.76
Mizoram	7.14	0.45	83.8	0.08	8.19	—	0.23
Nagaland	14.36	1.52	80.1	0.00	0.07	0.15	3.68
Tripura	89.34	6.74	1.20	0.01	2.69	0.01	0.01

*—1971 census figures for Assam

I remember trying to eat meat which tasted like rubber to me, but as a mark of respect for my religion I refused to eat beef.

مجھے یاد ہے کہ کس طرح میں گوشت کھانے کی کوشش کرتا تھا جس کا ذائقہ مجھے بالکل ربر کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ البتہ اپنے مذہب کے احترام میں گائے کا گوشت کھانے سے میں نے انکار کر دیا۔

مسٹر ٹھکر اپنے آشرم سے ایک انگریزی پرچہ اشانی (Ishani) کے نام سے نکالتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ سیاست اور مذہب کا دور ختم ہو گیا۔ مستقبل اب سائنس اور روحانیت کے لئے ہے:

The days of politics and religion are now over and the future belongs to science and spirituality.

میں نے کہا کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ سیاست کا رول اب محدود ہو گیا ہے۔ مگر سچا اور حقیقی مذہب بدستور علم اور روحانیت دونوں کے لئے گائڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔

گوہاٹی کے سیمینار (اور اس طرح کے دوسرے سیمیناروں میں جو باتیں میں نے سنیں اور مسلم اجتماعات میں جو باتیں کی جاتی ہیں، جب میں دونوں کا مقابلہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔ اس طرح کے سیمیناروں میں ہمیشہ ملکی مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ مثلاً گوہاٹی کے سیمینار میں ساری بحث دو نکتہ پر مرکوز رہی۔ اس علاقہ میں علیحدگی پسندی کے رجحان کو کس طرح ختم کیا جائے۔ اس علاقے کی معاشی پس ماندگی کو کس طرح دور کیا جائے۔ اس کے برعکس مسلم اجتماعات میں ساری بحث صرف مسلم کمیونٹی کے مسائل پر ہوتی ہے۔ یہ بحث بھی اس مفروضہ پر ہوتی ہے کہ مسلمان اس ملک میں تعصب اور ظلم کا شکار ہو رہے ہیں، اس کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔

اس صورت حال نے مسلمانوں کو ملک کی مین اسٹریم سے الگ کر دیا ہے۔ وہ اس طرح زندگی گزار رہے ہیں جیسے کہ وہ کوئی الگ قوم ہیں۔ مزید یہ کہ وہ اس ملک میں ایک محروم اور مظلوم طبقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک مسلمان بزرگ سے میں نے کہا کہ ہندستان کی قیادت کی سو سالہ سرگرمیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ——— پہلے ہنگامہ کر کے تقسیم کرانا، اور جب تقسیم

سے ان کے مسائل حل نہ ہوئے تو اس کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر دوبارہ فریاد شروع کر دینا۔

ایک صاحب نے کہا کہ اعداد و شمار پیش کر کے ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ گراس نیشنل پروڈکشن (جی این پی) میں اضافہ ہوا ہے۔ میں کہوں گا کہ اگر جی این پی بڑھا ہے تو ساتھ ہی ایک اور جی این پی بھی بڑھا ہے۔ یہ دوسرا جی این پی ہے ـــــ گراس نیشنل پاورٹی۔

ایک صاحب نے کہا کہ نارتھ ایسٹ انڈیا کا سارا مسئلہ مصنوعی تقسیم کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس غلطی کی تصحیح کیجئے، اور بنگلہ دیش کی سرحدوں کو ختم کر کے سارے علاقہ کو ایک جغرافی وحدت بنا دیجئے، اور پھر سارا مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائے گا۔

بنگلہ دیش کی طرف سے روزگار کی تلاش میں جو لوگ آتے ہیں، ان کو ایک صاحب نے ناخواندہ مہمان (unwelcome guests) بتایا اور کہا کہ ان کا سلسلہ بند ہونا چاہئے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ اس کا تعلق "بنگلہ دیش" سے نہیں ہے۔ یہ تو تقسیم کے بہت پہلے سے رائج ہے۔ معاشی ضرورت کے تحت ساری دنیا میں لوگ ادھر سے ادھر جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ بھی آتے ہیں، اور پھر اکثر واپس چلے جاتے ہیں۔

گوہاٹی کے انگریزی اخبار نارتھ ایسٹ ٹائمس (The North East Times) کا شمارہ ۳ جنوری دیکھا۔ اس میں نیو گوہاٹی کے جیبون سائیکیا (Jibon Saikia) کا خط پڑھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ کانگرس کی ووٹ بنک کی پالیسی کے نتیجہ میں بنگلہ دیش سے مسلمانوں کی آمد برابر جاری ہے۔ مسلمانوں کو خوش کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہا تو اگلے ۲۰ سال میں آسام ایک مسلم اکثریت کا علاقہ بن جائے گا :

It has now become crystal clear that Assam is going to be a Muslim majority state in India, in the course of near about twenty years. (p. 4)

اسی کے ساتھ اخبار میں بہت سی خبریں تھیں جو بتا رہی تھیں کہ یہاں کے جرائم کی رفتار بڑھ رہی ہے۔ امپھال کے علاقہ میں پانچ کوکی مار ڈالے گئے اور تین آدمی بری طرح زخمی ہوگئے۔ جورہاٹ میں پانچ مسلم نوجوان ایک بنک میں داخل ہوئے اور دو لاکھ ۴۴ ہزار روپیہ لے کر فرار ہو گئے۔ گرام دیو گاؤں میں پندرہ ڈاکوؤں کا ایک گروہ ایک اسکول ٹیچر مہندر داس کے گھر

میں گھس گیا۔ انھوں نے گھر والوں کو مارا اور ایک ہزار روپیہ نقد اور قیمتی سامان لے کر بھاگ گئے
دوموئی میں ایک ہتھیار بند گروہ ایک بنک میں داخل ہوا اور پچاس لاکھ روپیہ لے کر بھاگ گیا۔ وغیرہ
آسام میں بنگلہ دیشیوں کی آمد کا افسانہ صحیح ہے یا غلط، اس سے قطع نظر، آج لوگوں کا حال
یہ ہے کہ ریاست اگر بالفرض مسلم اکثریت کا علاقہ بننے والی ہو تو ان کو سخت پریشانی ہوگی، لیکن
اگر ان کی ریاست جرائم اکثریت کا علاقہ بن رہا ہو تو اس کے لئے انھیں کوئی پریشانی نہیں۔ یہی
غیر حقیقت پسندانہ مزاج ہے جس نے ملک کو موجودہ تباہی کے مقام پر پہنچایا ہے۔

مسٹر چارلس چاشی (Charles Chashie) انگریزی روزنامہ ناگالینڈ آبزرور کے اڈیٹر
ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس علاقہ کی ٹریجڈی دراصل لیڈرشپ کا فقدان ہے۔ انھوں نے آر ایم
لالہ کی کتاب قیادت کی تلاش (In Search of Leadership) کا حوالہ دیا۔ مصنف نے اس میں
میک گریگر (Mac Gregor) کا قول نقل کیا ہے کہ عوام کو بہتر حالت کی طرف لے جانے کا راز
قیادت کو بہتر بنانا ہے:

That people can be lifted into their better selves is the secret of transforming leadership.

میں نے کہا کہ یہ مسئلہ صرف اس علاقہ کا نہیں ہے بلکہ پورے ملک کا اور ہر کمیونٹی کا ہے۔ مگر
اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے یہاں اچھے لیڈر نہیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ عمومی جہالت اور بے شعوری
کی وجہ سے لوگ اچھے آدمی کو اپنا لیڈر نہیں بناتے۔ کیوں کہ اچھا لیڈر ہمیشہ حقیقت پسندی کی
بات کرتا ہے جس کی اہمیت کو بے شعور عوام سمجھ نہیں پاتے۔ اس کے برعکس برا لیڈر جذباتی
باتیں کرتا ہے جس کو ہر آدمی سمجھ لیتا ہے اور پرجوش طور پر اس کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔

کلکتہ سے مبارک کریم جوہر صاحب بھی اس سمینار میں آئے ہیں۔ ان کی عمر تقریباً پچاس سال ہے۔
اس مدت میں وہ بنگلہ زبان میں پچاس کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ان کی کئی کتابیں صوفی ازم پر ہیں۔
میں نے ان سے پوچھا کہ کوئی معرفت کی بات جو آپ نے اپنے مطالعہ میں پائی ہو اس کو بتائیے۔ انھوں
نے حسب ذیل الفاظ اپنے قلم سے لکھے: انسان اپنے کو جاننے سے تمام ادیان کا جاننا
ہو جاتا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ کلکتہ کے ہندو پبلشر ہر ایران سے اسلامی کتابیں مانگتے رہتے ہیں۔ مگر وہ ان کی فرمائش پوری نہیں کر پاتے۔ ان کی کتابیں زیادہ تر ہندو پبلشر نے چھاپی ہیں۔ صحیح بخاری اور اس طرح کی کئی دوسری کتابوں کا بنگلہ ترجمہ وہ چھپوا چکے ہیں۔ انھوں نے کلکتہ میں انڈین صوفی سماج کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ (Tel. 400475)

ایک مجلس میں ملک کی تقسیم پر بات ہونے لگی۔ ایک صاحب نے کہا کہ مسٹر محمد علی جناح تو ۱۹۳۰ میں لندن چلے گئے تھے اور وہاں پریوی کونسل میں پریکٹس کرنے لگے تھے۔ پانچ سال بعد نواب زادہ لیاقت علی خاں لندن گئے۔ اور ان کو ہندستان واپسی کے لئے آمادہ کیا۔

حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ یہ سب غیر ضروری باتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب کے سب ملک کی تقسیم کے ذمہ دار ہیں۔ اور ہم ہی کو اس کی قیمت ادا کرنا ہے:

We all are responsible for partition and we have to pay the price.

ایک صاحب نے بتایا کہ راج موہن گاندھی نے اپنی انگریزی کتاب (آٹھ زندگیاں) میں لکھا ہے کہ مسٹر محمد علی جناح جب ہندستانی پالٹکس سے الگ ہو کر لندن چلے گئے تو اس کے بعد برٹش سرکار کے کسی ذمہ دار نے بات کرتے ہوئے جواہرلال نہرو سے پوچھا کہ جناح کا معاملہ کیا ہے۔ نہرو نے جواب دیا کہ جناح تو سیاسی اعتبار سے ختم ہو گئے (Jinnah is finished) جناح تک یہ خبر پہنچی تو انھوں نے کہا کہ اچھا، میں ان کو دکھاؤں گا کہ میں کس طرح زندہ ہوں:

Finished, I will show him.

اس کے بعد نواب زادہ لیاقت علی خاں لندن گئے۔ اور مسٹر جناح کو ہندستان واپس آنے کے لئے کہا۔ مسٹر جناح نے کہا کہ آپ ہندستان واپس جائیے اور لوگوں کی رائے معلوم کر کے مجھے بتائیے۔ لیاقت علی خاں واپس آئے۔ اور لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے بعد مسٹر جناح کو ایک ٹیلی گرام بھیجا۔ یہ ٹیلی گرام صرف ایک لفظ پر مشتمل تھا ـــــ آجائیے (come) اس طرح مسٹر جناح دوبارہ ہندستانی پالٹکس میں واپس آ گئے۔

انھوں نے بتایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۷ کے الکشن کے بعد جناح کانگرس سے الگ ہو گئے اور ملک کی تقسیم پر پختہ ہو گئے۔ مگر مولانا آزاد کے بیان کے

مطابق، یہ مسئلہ صرف یہ نہیں تھا کہ یوپی کیبنٹ میں کانگرسی مسلمان لئے جائیں یا مسلم لیگی مسلمان۔ اصل یہ ہے کہ مسلم لیگ نے اپنے جن دو آدمیوں کو کیبنٹ میں شامل کرنے کے لئے جو دو نام دئے تھے، وہ لیاقت علی خاں اور عبد الرحمان نشتر تھے۔ دونوں زمیندار طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے جے پرکاش نرائن، رام منوہر لوہیا جو کسان لیڈر تھے، وہ اس کے سخت مخالف ہو گئے۔ یہ لوگ سوشلسٹ ذہن کے تھے اور اس زمانہ میں زمینداری کے خلاف تحریک چلا رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم زمینداروں کو اپنی کیبنٹ میں لیں تو ہم عوام کو کیا جواب دیں گے۔ یہ وجہ تھی جس کی بنا پر مسلم لیگ کے نامزد افراد کو کیبنٹ میں لینے سے انکار کیا گیا۔

مسٹر بی کے رائے برمن نے اپنے مفصل پیپر میں نارتھ ایسٹ کے قبائل کے لئے حق خود اختیاری (right of self-determination) کی وکالت کی اور اس علاقہ کے مسئلہ کا حل یہ بتایا کہ ان کو اٹانومی دی جائے۔ تاہم انھوں نے کہا کہ حق خود اختیاری سے ان کی مراد حق خود انتظامی (right of self-management) ہے نہ کہ انقطاع (secession)۔ اس سلسلہ میں انھوں نے دستور ہند کے علاوہ اقوام متحدہ کے ڈیکلریشن اور انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز کا حوالہ دیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ اصل المیہ یہ ہے کہ ہمارے دستور میں شہریوں کے حقوق کی دفعہ تو موجود ہے۔ مگر اس میں شہریوں کی ذمہ داری کی کوئی دفعہ نہیں۔ چنانچہ اب سارے ملک کا یہ حال ہو رہا ہے کہ لوگ اپنے حقوق کو تو آخری حد تک جانتے ہیں، مگر اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی انھیں خبر نہیں۔ ہمارا ذہن کچھ اس طرح بن گیا ہے جیسے کہ آزاد ملک کے لوگوں کے صرف حقوق ہوتے ہیں، ان کے کوئی فرائض نہیں ہوتے:

Citizens of a free country have only rights and rights and rights, but no duties.

اس معاملہ میں مسلمانوں کا کوئی استثنا نہیں۔ میں مسلم دانشوروں کی جتنی بھی تحریریں پڑھتا ہوں ہر ایک میں صرف مسلمانوں کے حقوق بتائے جاتے ہیں۔ کوئی بھی نہیں جو مسلمانوں کو بتائے کہ مسلمان جس ملک میں یا جن لوگوں کے درمیان رہتے ہیں ان کے

تئیں ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔

ایک مجلس میں ایک صاحب پرجوش تقریر کر رہے تھے کہ بنگلہ دیش سے مسلمان برابر سرحد پار کر کے ہمارے یہاں آ رہے ہیں، یہ سلسلہ بند ہونا چاہئے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ بنگلہ دیش کو ختم کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے، پھر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مسٹر بنجے ہزاریکا نے کہا کہ مائیگریشن موجودہ زمانہ کی ایک عام چیز ہے۔ امریکہ بھی اس کو روک نہیں سکتا، پھر ہم کیسے اس پر روک لگا سکتے ہیں۔

پھر انھوں نے کہا کہ نصف ملین ہندستانی نیپال چلے گئے ہیں۔ وہاں ان کا جانا نیپال کے لئے ایک مسئلہ ہے۔ مگر ہم ایسا نہیں کرتے کہ ان ہندستانیوں کو وہاں سے واپس لانے کی بات کریں۔ پھر بنگلہ دیش والوں پر اتنا شور کیوں۔ ہم ڈبل اسٹینڈرڈ نہیں ہو سکتے۔

ایک صاحب نے کہا کہ اس علاقہ میں علیحدگی پسندی کا رجحان پیدا ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ ترقیات کا فائدہ خواص تک رہ جاتا ہے، وہ عوام تک نہیں پہنچتا:

The fruit of developments do not perculate to the grassroot level.

دوسرے صاحب نے کہا کہ یہی اصل بات نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب کو ترقیاتی پروگراموں کا اتنا فائدہ پہنچا کہ وہ ملک کی سب سے زیادہ خوش حال ریاست بن گئی۔ وہاں اس معاملہ میں عوام و خواص میں کوئی تفریق نہیں۔ اس کے باوجود پنجاب میں علیحدگی کی خوں ریز تحریک شروع ہوئی۔

۴ جنوری کی شام کے اجلاس میں مجھے موقع دیا گیا۔ میں دہلی سے ایک انگریزی پیپر تیار کر کے لے گیا تھا جو ملک میں بڑھتی ہوئی علاقائیت پسندی کے خلاف تھا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ علیحدہ خطہ بنانا کسی کے مسائل کا حل نہیں ہے۔ اس معاملہ کو پاکستان اور بنگلہ دیش کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ دونوں ہی مسائل کے حل کے نام پر علیحدہ ملک کے طور پر وجود میں آئے۔ مگر دونوں میں سے کسی جگہ بھی مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ بلکہ مسائل پہلے سے زیادہ بڑھ گئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جغرافی تقسیم یا علیحدگی سے مسائل کے حل کا کوئی تعلق نہیں۔

سمینار کے ناظم مسٹر نتور ٹھکر نے آخر وقت میں کہا کہ آپ کو ایک اور موضوع پر بھی بولنا ہے۔

وہ مذہبی ہم آہنگی اور کلچرل ٹالرنس کا مسئلہ ہے۔ اس موضوع پر پہلے سے میں نے کچھ تیار نہیں کیا تھا۔ اسی وقت بیٹھ کر انگریزی میں ایک پیپر لکھا اور اس کو وہاں پیش کیا لوگوں نے بہت پسند کیا۔

اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مذہبی اختلافات یا کلچرل اختلاف کے مسئلہ کا حل اختلاف کو ختم کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کو ٹالریٹ کرنا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی تفصیل کرتے ہوئے آخر میں میں نے کہا کہ اس مسئلہ کا حل سوامی ویویکانند نے ایک جملہ میں اس طرح بتایا ہے ـــــ ایک کی اتباع کرو، اور کسی کے خلاف نفرت نہ کرو:

Follow one, and hate none.

میرا پیپر، دوسرے پیپروں کی طرح، حاضرین کے درمیان تقسیم کیا گیا۔ ہر پیپر کی کاپیاں پہلے سے تیار کی جاتی تھیں اور وہ ہال میں لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھیں۔

۴ جنوری کی شام کا اجلاس تاخیر کے ساتھ ساڑھے چھ بجے ختم ہوا۔ ہر آدمی جو اسٹیج پر آتا وہ لمبی تقریر کرنے لگتا۔ جب مقرر مدت سے زیادہ وقت ہو گیا تو صدر اجلاس مسٹر پی ایچ ترویدی (آئی ایس آئی) نے بحث کے خاتمہ کا اعلان کرتے ہوئے مائک اٹھایا تاکہ وہ صدر کی حیثیت سے اپنے آخری کلمات کہہ سکیں۔ عین اسی وقت حاضرین میں سے ایک خاتون نے بلند آواز سے کہا "کیا میں ایک منٹ لے سکتی ہوں"۔ صدر نے جواب دیا کہ نہیں، اب وہ ایک منٹ کسی کے لئے باقی نہیں رہا:

We have no that one minute.

یہ سن کر مجھے موت کے لمحہ کا خیال آگیا۔ میں نے سوچا کہ آدمی کی عمر کا آخری وقت جب آئے گا اور موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے کے لئے پہنچے گا تو آدمی کہے گا کہ ایک منٹ کی مہلت مجھے اور دے دو۔ فرشتہ جواب دے گا کہ اس ایک منٹ کا وقت گزر چکا۔ اب وہ ایک منٹ کہاں۔

منی پور کے مسٹر نیل کنٹھ شرما نے کہا کہ ہمارے علاقہ کے نوجوان کثرت سے ہتھیار اور ڈرگ کی طرف جا رہے ہیں۔ حتی کہ ڈرگ سے بچانے کے لئے ان کے والدین اپنے بچوں سے کہتے ہیں کہ تم کو شراب پینا ہو تو پی لو، لیکن ڈرگ کے قریب نہ جاؤ۔ یہ سب اس لیے کہ ان

نوجوانوں میں بے روزگاری اور وسائل معاش کی کمی نے سخت فرسٹریشن پیدا کر دیا ہے۔

انفرادی ملاقات میں مسٹر پی ایچ ترویدی نے کہا کہ یہاں جو لوگ اکٹھا ہوئے ہیں، وہ وہ لوگ ہیں جو فساد نہیں کرتے۔ فساد کرنے والے تو دوسرے لوگ ہیں اور ہمارے ان کے درمیان کوئی لنک نہیں۔ میں نے کہا کہ اس کو میں اس طرح کہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں ایک پرابلم گروپ ہے اور دوسرا نو پرابلم گروپ۔ چنانچہ میں پچھلے دو سال سے پرابلم گروپ کے لوگوں سے ربط قائم کر کے ان کی سوچ کو بدلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

انتہا پسند ناگاؤں کے خیالات کتنے سخت ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں ہم ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔ ۶۲ سالہ مسٹر موئیوا (Thuingaleng Muivah) مشہور ناگا لیڈر ہیں۔ وہ نیشنل سوشلسٹ کونسل آف ناگالینڈ کے فاؤنڈر ہیں۔ ان کے اوپر کئی قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں۔

سنڈے کے نمائندہ مسٹر سوبیر بھومک (Subir Bhaumik) اور ان کے ساتھی تھائی لینڈ اور برما کی سرحد پر ایک خفیہ مرکز میں ان سے ملے۔ وہ لوگ ۱۸ گھنٹہ تک جنگلوں میں سفر کر کے مسٹر موئیوا کے یہاں پہنچے تھے۔ انھوں نے ناگا لیڈر کا انٹرویو لیا جس کو خود ناگا لیڈر انٹرویو کے بجائے انٹرایکشن کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ سنڈے کے شمارہ ۱۶ جون ۱۹۹۶ میں یہ انٹرویو پانچ صفحات پر چھپا ہے جس کے ساتھ کئی تصویریں بھی شامل ہیں۔ اس انٹرویو کا ایک سوال وجواب یہاں نقل کیا جاتا ہے:

Q. But unless you start talking, how do you know how sincere India is about a settlement?

A. Mr. Bhaumik, it may hurt your feelings as an Indian if we tell you how bad our experience has been in this regard. India's government, her bureaucrats are masters of double-talk, your society has so much double standard. I have read your epics and even your heroes like Rama and Krishna have made and broken rules at their convenience. Rama used dissension to subjugate Bali's kingdom, a kingdom of tribals. His brother Sugriv was used. Krishna signalled to Bhim to hit Duryodhana below his waist when Bhim was all at sea. Whenever rules have proved to be problem, your society and its leaders have flouted it, expecting everyone else to observe them.

Sunday weekly, Calcutta, 16-22 June 1996, p. 50

اشانی کے شمارہ اپریل ۱۹۹۶ میں منی پور کے شہری رتن تھیم (Ratan Thiyyam) کا انٹرویو چھپا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کی دنیا میں مجھ سے زیادہ غم گین شاید اور کوئی نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آج میرے وطن منی پور کی کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر باقی نہیں رہی:

Nothing seems to be in place in Manipur today.

انھوں نے کہا کہ پہلے ہم منی پور کے لوگ بہت آسودہ زندگی گزارتے تھے۔ ہمارا ہر معاملہ درست تھا۔ کھانا پینا، ہر چیز فراغت کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ آج سب کچھ تباہ ہو چکا ہے۔ قدیم روایتیں ختم ہو گئیں۔ ہمارا اعتماد جاتا رہا۔ ۳۰ سال کی مدت میں پوری زندگی کچھ سے کچھ ہو گئی۔

یہ سب نتیجہ ہے علاحدگی پسندی کی انتہا پسندانہ اور متشددانہ تحریک کا۔ میں نے اس کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ آج ٹھیک یہی حال ان تمام مسلم علاقوں کا بھی ہے جہاں آزادی کے نام پر اسی قسم کی تحریکیں چلائی گئیں۔ مثلاً بوسنیا، چیچنیا، برما، فلپائن، فلسطین، وغیرہ۔ ہر جگہ آج سے "۳۰ سال" پہلے مسلمان نہایت عمدہ حالت میں تھے۔ ہر قسم کی ترقی کے مواقع انھیں حاصل تھے۔ مگر انھوں نے متشددانہ قسم کی سیاسی تحریکیں چلا دیں۔ اس کے نتیجہ میں ملا ہوا بھی تباہ ہو گیا۔ اور مزید کچھ تو ملنے والا ہی نہ تھا۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ لوگوں کو اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ وائلنٹ ایکٹوزم کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب صرف نان وائلنٹ ایکٹوزم یا پیس فل ایکٹوزم ہی ممکن ہے۔ اور وہ بھی اس وقت جب کہ فی الواقع اس کی ضرورت پیش آ گئی ہو۔

نارتھ ایسٹرن انڈیا میں علاحدگی پسندی کے رجحان کو ختم کرنے اور اس کو ملک کی مین اسٹریم میں لانے کے لئے بار بار نئی دہلی اور مقامی لیڈروں کے درمیان میٹنگیں ہوئیں اور اکارڈ طے پائے۔ مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ مثلاً:

Shillong Accord 1975, Assam Accord 1985, Mizoram Accord 1986, Tripura Accord 1988, Bodo Accord 1994

اس کے باوجود اس علاقہ کی بے چینی ختم نہیں ہوئی۔ درجنوں عسکری تنظیمیں بدستور پورے علاقہ میں سرگرم ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس علاقہ کی معاشی اور تمدنی پسماندگی بدستور باقی ہے۔

ہندستان ٹائمس کے اسسٹنٹ اڈیٹر مسٹر آش نرائن رائے کا ایک مقالہ جنرل آف پیس اسٹڈیز (نئی دہلی) کے شمارہ جولائی۔ اگست ۱۹۹۵ میں چھپا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ اس علاقہ میں امن اور ہم آہنگی کی کنجی محض اکارڈوں پر دستخط کرنا نہیں ہے بلکہ ضرورت یہ ہے کہ یہاں اقتصادی ترقی لائی جائے اور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ معاشی وسائل فراہم کئے جائیں:

The key to peace and harmony in the region lies not in merely signing accords but in the rapid economic development and the widening of economic opportunities. (Ash Narain Roy)

جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، خرابی کی اصل جڑ کرپشن ہے، مرکزی حکومت کی طرف سے اس علاقہ کی ترقی کے لئے بہت بڑی رقمیں منظور کی گئیں مگر وہ زیادہ تر لوگوں کی جیبوں میں چلی گئیں۔ اس علاقہ کے ترقیاتی کاموں میں وہ بہت کم استعمال ہوسکیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ یہ درست ہے کہ نارتھ ایسٹ ایریا ایک پرابلم ایریا بن گیا ہے۔ لیکن ہر مسئلہ کا الزام حکومت کو دینا صحیح نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ تو ہم اپنے عمل کی قیمت بھگت رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ سے پہلے جب ہندستان میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی تو ہمارے سیاسی لیڈر ہر مسئلہ کا الزام برٹش گورنمنٹ کو دیدیتے تھے، خواہ وہ کوئی بھی مسئلہ ہو۔ اس وقت یہ بات بہت اچھی لگتی تھی۔ کیوں کہ اس طرح عوام انگریزوں کے خلاف اٹھ رہے تھے اور وہ عوامی طاقت ظہور میں آرہی تھی جو ہماری بے تشدد تحریک آزادی کو طاقت ور بنانے کے لئے ضروری تھی۔

اس طرح عوام کی نفسیات یہ بن گئی کہ تمام مسائل کی ذمہ دار حکومت ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ اپنے اس مزاج کی بنا پر اب وہ اسی طرح ہر خرابی کا الزام قومی حکومت کو دے رہے ہیں۔ یہ قیمت ہمیں اس وقت تک بھگتنا ہوگا جب تک عوام میں نیا شعور پیدا نہ کر دیا جائے۔

ایک پرانے گاندھی وادی نے بتایا کہ جب وہ نوجوان تھے، وہ کھادی کی ایک کانگریس دکان پر کپڑا خریدنے گئے۔ دکان والے نے پوچھا: ہاتھ کھادی یا مل کھادی۔ یعنی ہاتھ سے بنے ہوئے سوت کی کھادی یا مل میں تیار کئے ہوئے سوت کی کھادی۔ مذکورہ نوجوان کو اس سے بہت دھکا لگا۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کو خط لکھا کہ میرے ساتھ ایسا ایسا واقعہ گزرا۔ کیا کھادی بھی دو کھادی ہوتی

ہے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔

گاندھی جی نے اس خط کا جواب اپنے پرچہ ینگ انڈیا میں دیا۔ انھوں نے لکھا کہ نوجوان کو اس طرح کے معاملات میں زیادہ حساس (oversensitive) نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے کہا یہ نہایت صحیح جواب تھا۔ اگر معاملہ حق اور ناحق کا ہو تو آدمی کو ضرور بہت زیادہ حساس ہونا چاہئے۔ مگر جو معاملہ حق اور ناحق سے تعلق نہ رکھتا ہو تو اس میں نظر انداز کرنے کی پالیسی اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس فرق کے بغیر زندگی کا نظام نہیں چلایا جاسکتا۔

ایک صاحب نے کہا کہ گاندھی جی جب ساؤتھ افریقہ سے آئے تو وہ کوٹ پتلون پہنتے تھے۔ پھر گاندھی جی نے کہا کہ آزادی کی تحریک میں شریک ہونے سے پہلے میں سارے دیش میں گھوم کر لوگوں سے ملوں گا۔ چنانچہ انھوں نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ملک میں بے شمار لوگ ابھی تک غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے جسم پر پورا کپڑا بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد گاندھی جی نے کہا کہ جس دیش میں غریبوں کی اکثریت ہو وہاں آزادی کی تحریک چلانے کے لئے مجھے خود بھی غریب ہندستانی کی طرح رہنا ہوگا۔ یہ کہہ کر انھوں نے کوٹ پتلون اتار دیا اور وہ کپڑا پہن لیا جس کو دیکھ کر برطانیہ کے سرونسٹن چرچل نے ان کو ننگا فقیر (naked fakir) کہا تھا۔

کوہیما سے ایک انگریزی اخبار نکلتا ہے۔ اس کا نام جرنل (The Journal) ہے۔ اس کے شمارہ ۱۷ نومبر ۱۹۹۴ میں ایک جائزہ چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا —— جبری استحصال کی زمین (A Land of Extortion) اس میں بتایا گیا تھا کہ اس علاقہ کے بیرونی آئی اے ایس افسران بہت غیر مطمئن حالت میں ہیں۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں:

Non-local IAS officers want to be transferred out of Nagaland as quickly as possible.

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہر وقت ان کو اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے۔ غیر مقامی افسروں کو یہاں کے لوگ اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس طرح ۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں انگریز افسران کو دیکھا جاتا تھا۔ مقامی لیڈروں کی تقریروں نے اس معاملہ میں لوگوں کو اتنا جذباتی بنا دیا ہے کہ غیر مقامی افسروں کو دیکھ کر وہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ ہم کو غلام بنانے کے لئے یہاں آئے ہیں۔

اگرتلہ (تری پورہ) کی شریمتی کرابی دیو برمن نے اپنے پیپر میں نارتھ ایسٹ انڈیا کے بارہ پرابلم گنائے۔ ان میں سے بارھواں یہ تھا ـــــ سب سے زیادہ اہم یہ کہ اس علاقہ کے لوگوں میں ایسے مشترک رشتہ کی غیر موجودگی کہ وہ اپنے آپ کو انڈین محسوس کریں:

Above all absence of a common chord or a binding force to feel 'Indian'.

یہ بلاشبہ سب سے زیادہ اہم بات ہے۔ اگر انڈین ہونے کا مشترک احساس موجود ہو تو بقیہ مسائل اپنے آپ غیر اہم بن جاتے ہیں۔ اور اگر یہ مشترک احساس باقی نہ رہے تو اس کے بعد غیر اہم چیز بھی اہم بن جائے گی۔

مقامی انگریزی اخبار ناگالینڈ ٹائمس (۲۳ نومبر ۱۹۹۴) میں اس علاقہ کی سات ریاستوں کے بارہ میں ایک رپورٹ چھپی تھی جس کا عنوان تھا:

Symphony of the Seven Sisters.

اس میں بتایا گیا تھا کہ نارتھ ایسٹ کی سات ریاستوں (آسام، ناگالینڈ، منی پور، میگھالیہ، میزورم، اروناچل پردیش، تری پورہ) میں ہر ایک کا مخصوص کلچر ہے۔ ہر ایک کا مذہب اور زبان الگ الگ ہے۔ ان پر پڑوسی ممالک برما، چین، تبت کلچر کے اثرات ہیں۔ چنانچہ اس علاقہ کی کوئی مشترک زبان نہیں۔ اس کی وجہ سے "سات بہنوں" کا باہمی اتحاد بے حد مشکل ہو گیا ہے۔

ناگالینڈ ٹائمس کی اس رپورٹ میں مزید بتایا گیا تھا کہ درحقیقت انڈیا کا ہندو کلچر ان قبائل کے لئے اجنبی ہے جو کہ بنیادی طور پر گوشت خور ہیں:

Hindu culture is much alien to the psyche of the tribals who are basically non-vegetarians and liberated in their way of life.

اس میں بتایا گیا تھا کہ نارتھ ایسٹ کا یہ علاقہ ۱۸۲۶ میں امریکن اور یوروپین مشنری کے زیر اثر آیا۔ اور اس پہاڑی علاقہ میں مسیحیت نے اپنی جڑیں قائم کر لیں۔ یہ ان مسیحی مبلغین کے ذریعہ ہوا جنھوں نے ان پہاڑیوں میں انتھک محنتیں کیں۔ مثال کے طور پر میگھالیہ کے قبائل کی بولی کو لکھنے پڑھنے کی زبان بنانے کا کارنامہ ٹامس جونز (Rev. Thomas Jones) وغیرہ نے کیا۔ ان لوگوں نے میگھالیہ کے قبائل کو ان کی پہلی مطبوعہ کتاب دی۔ انھوں نے یہاں اسکول اور اسپتال

قائم کئے۔ انھوں نے اس علاقہ کے لوگوں کو پہلی بار علم سے آشنا کیا۔ تاہم ان مسیحی مبلغوں کے اثرات سے منی پور اور ارونا چل بچا رہا۔

۴ جنوری کی شام کو کھانے کی میز پر کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحبان تھے۔ وہ گاندھی واد میں یقین رکھتے تھے۔ ڈاکٹر جینت پاٹل (ممبر پلاننگ کمیشن) نے کہا کہ ساری سمسیاؤں کا حل گاندھی واد میں ہے۔ گاندھی کے وچاروں کو دیش میں لانا ہوگا، تبھی دیش کا بھلا ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ کے بعد مہاتما گاندھی کے اپنے بنائے ہوئے ساتھی ان سے پھر گئے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے جو گاندھی ہیرو بنا ہوا تھا، وہ ۱۹۴۷ کے بعد خود اپنے ملک میں زیرو ہو گیا۔ چنانچہ اس وقت مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ "اب میری کون سنے گا"۔ ان کے اسی جملہ کو پیارے لال نے اپنی کتاب کا ٹائٹل بنایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد انڈیا میں خود گاندھی جی اپنے وچاروں کو عمل کی صورت نہ دے سکے۔ پھر اب کون ہوگا جو ان کو عملاً قائم کرے۔ کیا آپ کہیں سے ایک سپر گاندھی لا سکتے ہیں۔ بمبئی کے پروفیسر رو ندر کیلکر بھی اس گفتگو میں شریک تھے۔

پھر میں نے کہا کہ وہ مقام جہاں گاندھی واد فیل ہوا ہے وہ لارڈ ایکٹن کے الفاظ میں انسان کی یہ کمزوری ہے کہ طاقت اور اقتدار آدمی کو بگاڑ دیتا ہے:

Power currupts and absolute power corrupts absolutely.

کانگرس کے لیڈروں کے بگڑنے کا اصل سبب یہی تھا۔ اب ہمیں اس انسانی کمزوری کا حل تلاش کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر ہمارے خوابوں کا نیا ہندستان بننے والا نہیں۔

ایک مجلس میں یہ بحث تھی کہ سیاسی استحکام کیسے حاصل کریں۔ (how to attain political stability) مختلف لوگوں نے مختلف باتیں کہیں۔ میں نے کہا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد کوئی بھی پارٹی اپنے حق میں نئی سیاسی روایات قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ کانگرس بعد از آزادی کارکردگی پر زندہ نہیں تھی بلکہ قبل از آزادی روایات کے سہارے زندہ تھی۔ کانگرس کا سارا سرمایہ جدوجہد آزادی کے دور کی روایات تھیں۔ یہ سرمایہ اب اپنی آخری حد پر پہنچ کر ختم ہو گیا۔

بھاجپا کے پاس کوئی مثبت پیغام نہ تھا۔ اس نے دو بڑے فرقوں کے درمیان چھپی ہوئی

تاریخی نفرت کو استعمال کیا، مگر اس کی بھی ایک حد تھی۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو خود اسی کے ہاتھوں اس کی آخری حد آگئی۔ اب ملک میں ایک قسم کا سیاسی خلا ہے، اور ملک کسی ایسے نئے گروہ کا منتظر ہے جو ظاہر ہو اور دوبارہ ملک کو سیاسی استحکام دے سکے۔

نارتھ ایسٹ انڈیا سات مختلف ریاستوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے ان کو سات بہنیں کہا جاتا ہے۔ دھنک میں چوں کہ سات الگ الگ رنگ ہوتے ہیں، اس لئے ان ریاستوں کے مجموعہ کو زمینی دھنک کا نام بھی دیا گیا ہے:

a rainbow on the ground.

ان سات ریاستوں میں آپ گھومیں پھریں تو آپ کو ہر طرف وہاں مسائل ہی مسائل دکھائی دیں گے۔ مگر الفاظ کی دنیا میں اس کی تصویریں بالکل برعکس دکھائی دیتی ہیں۔ جو لوگ صرف الفاظ کو دیکھ کر حقیقت کے بارہ میں رائے قائم کریں وہ ہمیشہ اصل حقیقت کے ادراک سے محروم رہیں گے۔

۵ جنوری کو صبح ۳ بجے نیند کھلی۔ مجھے ٹی وی کا کوئی شوق نہیں۔ مگر میں نے سوچا کہ دیکھیں کیا رات کو بھی ٹی وی کے پروگرام آتے ہیں۔ میں نے یہ جاننے کے لئے ٹی وی سیٹ کھولا تو اس وقت کئی پروگرام آرہے تھے۔ ایک چینل سے کھیل کا پروگرام آرہا تھا۔ دوسرے چینل پر غالباً کوئی انگریزی فلم دکھائی جارہی تھی۔ اس کا جو منظر میرے سامنے آیا اس میں ایک مرد اور ایک عورت کھڑے ہوئے تھے۔ عورت اپنے اتارے ہوئے کپڑے کو پہن رہی تھی۔ اس نے اپنے کھلے جسم پر مختصر لباس پہنا اور مرد کی ناک پر پستول رکھ کر اسے گولی مار دی۔

ہندستان میں کچھ لوگ یہ لکھنے اور بولنے میں مشغول ہیں کہ ہندو ایک منظم سازش کے تحت ہمارے ملی تشخص کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ یہ بے حد سادہ لوحی کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہندو اور مسلمان دونوں کے روایتی تشخص کو مٹانے کا کام سٹلائٹ ٹی وی کررہا ہے جس کی زد سے اپنے آپ کو بچانا دونوں میں سے کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ یہ ٹی وی رات دن کھیل کود، مار دھاڑ اور سیکس کے مناظر دکھاتا رہتا ہے۔ اس کی ہمہ گیری کا یہ حال ہے کہ

زمین پر اگر آپ اس کو روکیں تو وہ آسمان سے آپ کے گھروں میں داخل ہو جائے گا۔ یہ طوفانی سیلاب نہ صرف ہندستان کو بلکہ تمام عرب دنیا اور مسلم دنیا کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔ میری طرح کے کچھ لوگ جو اپنے ذوق کے تحت محفوظ نہ ہو سکتے ہوں وہی اس سے بچے ہوئے ہیں۔ ورنہ نام نہاد دیندار گھرانے تک اس فتنہ سے محفوظ نہیں۔

۵ جنوری ۱۹۹۵ کی صبح کو ناشتہ کی میز پر مسٹر ترویدی (آئی اے ایس) سے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا کے جھگڑوں کو ختم کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ مذہب کے بارہ میں گاندھی جی کے نظریہ کو پھیلایا جائے۔ یعنی یہ کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں دو نقطۂ نظر ہیں۔ ایک یہ کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔ یہ نظریہ بظاہر خوبصورت معلوم ہوتا ہے مگر وہ یقینی طور پر قابل عمل نہیں۔ شہنشاہ اکبر سے لے کر ڈاکٹر بھگوان داس (اسینشل یونیٹی آف آل ریلیجنز) اور مہاتما گاندھی تک غیر معمولی کوشش کے باوجود یہ نظریہ سراسر ناکام رہا ہے:

حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کا حل باہمی اعتراف (mutual recognition) میں نہیں ہے بلکہ باہمی احترام (mutual respect) میں ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ ناگالینڈ اور منی پور کی حیثیت ٹائم بامب کی ہو چکی ہے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ یہ صرف دو ریاستوں کی بات نہیں۔ بلکہ نارتھ ایسٹ کا پورا علاقہ آج اسی حالت کو پہنچ چکا ہے۔ اس طرح کی اور بہت سی باتیں لوگ کر رہے تھے، اور میں سوچ رہا تھا کہ اردو اخباروں میں ہمارے لکھنے والے جو کچھ لکھتے ہیں، اس کے مطابق، اردو خواں مسلمانوں کو صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ اس علاقہ میں مسلمانوں کے خلاف شدید تعصب ہے اور بنگلہ دیشی کے نام پر مسلمانوں کو یہاں سے نکالا جا رہا ہے۔ حالانکہ "بنگلہ دیشی مسئلہ" اس علاقہ میں پیدا شدہ مسائل کا صرف ایک فیصد ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ مذہب اور کلچر کے اختلافات میں یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے مذہب کی پیروی کرتے ہوئے دوسروں کے مذہب کا احترام کریں:

We have to respect other religions while following our own.

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں یہی صحیح ترین بات ہے اور یہی واحد قابل عمل صورت ہے۔ اس معاملہ میں ہمیں پریکٹیکل بننا چاہئے نہ کہ آئیڈیلسٹ۔ عجیب بات ہے کہ ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ ہو تو ہر آدمی پریکٹیکل بن جاتا ہے۔ مگر جب ملک اور سماج کے بارہ میں گفتگو ہو تو ہر آدمی آئیڈیلزم کی بات کرنے لگتا ہے۔ اسی دوطرفہ معیار نے سارے مسائل پیدا کئے ہیں۔

سیمنار کا مقصد ان لفظوں میں بتایا گیا تھا کہ —— نارتھ ایسٹ اور ملک کے بقیہ حصوں کے دانشوروں کو باہمی تبادلہ خیال کا موقع دینا:

to facilitate interaction between the intellectuals of the North-East and the rest of the country.

مگر میرا تجربہ ہے کہ برصغیر ہند کے دانشوروں کا تبادلۂ خیال ہمیشہ بے فائدہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں سننے اور ماننے کا مزاج نہیں۔ ہر ایک میں صرف سنانے اور منوانے کا مزاج ہے۔ یہاں کا ہر آدمی اعجاب کل ذی رأي برأيه کا مصداق ہے۔ ایسے لوگوں کے درمیان تبادلۂ خیال کبھی کسی مثبت نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔

گوہاٹی کا یہ انٹرنیشنل سیمنار بڑی امیدوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اس کا اہتمام ناگالینڈ گاندھی آشرم کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف اداروں نے اس کے ساتھ تعاون کیا۔ خاص طور پر حسب ذیل ادارہ نے:

North-East Institute of Bank Management (NEIBM)

اس کا بنیادی موضوع تھا: نارتھ ایسٹ انڈیا اور اکیسویں صدی۔ اس کے چھ ذیلی موضوعات مقرر کئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک موضوع یہ تھا:

North-East, a rainbow on the ground
Religious and ethnic pluralism—amity through diversity
—a future perspective.

آخری اجلاس میں منتظمین کی طرف سے ایک رزولیوشن کا ڈرافٹ پیش کیا گیا۔ اس پر بحث ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کو رد کر دیا گیا۔ پھر یہ طے ہوا کہ ایک اسٹیٹمنٹ جاری کیا جائے۔

اس کا ڈرافٹ بھی رد ہوگیا۔ آخر میں طے ہوا کہ اجلاس کے دوران جو مختلف رائیں سامنے آئی ہیں، ان کا خلاصہ تیار کیا جائے اور اس کو اشاعت کے لئے دے دیا جائے۔ دو آدمیوں نے اس کا ڈرافٹ تیار کیا۔ مگر وہ بھی منظور نہ ہوسکا۔ آخر کار یہ سمینار اس طرح ختم ہوا کہ اس کی طرف سے کوئی متفقہ چیز پریس میں اشاعت کے لئے نہ دی جاسکی۔

میں بے حد غم زدہ حالت میں یہ تمام بحثیں سن رہا تھا۔ آخر میں میں نے کہا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک سنگین قومی مسئلہ پر پورے ملک کے دماغ اکٹھا ہوئے۔ تین دن کے بحث و مباحثہ کے بعد اب وہ یہاں سے واپس جارہے ہیں۔ اور حالت یہ ہے کہ ہم اتنا بھی نہیں کرسکے کہ ایک متفقہ بیان تیار کرکے کل کے اخبار میں دے دیتے تاکہ لوگ کم سے کم یہ جان لیں کہ ہم نے انھیں کیا پیغام دیا ہے۔

۶ جنوری کی شام کو واپسی تھی۔ ہوٹل سے ایرپورٹ تک کے سفر میں دو صاحبان کا ساتھ تھا۔ پرتاپ سنگھ اور عبدل بھائی۔ ایرپورٹ پر دیر تک ان لوگوں سے گفتگو ہوئی۔ پرتاپ سنگھ ایک سیاسی آدمی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ تمام لیڈر کرپٹ ہیں، خواہ ایک پارٹی کے ہوں یا دوسری پارٹی کے۔ میں نے کہا کہ پالی ٹکس میں ہمیشہ کرپشن رہتا ہے۔ البتہ اس کو ایک حد کے اندر رہنا چاہئے۔ ہندستان کی مصیبت یہ ہے کہ یہاں کا کرپشن حد سے باہر چلا گیا ہے۔

عبدل بھائی مسلمانوں میں نکاح و طلاق کے مسائل سے بہت پریشان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سلسلہ میں کچھ اصلاحی قانون بننا چاہئے۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں اصل مسئلہ قانون کا نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم بہت کم ہے۔ تعلیم یافتہ آدمی ہی جانتا ہے کہ کیسے جینا چاہئے۔ اس لئے اگر آپ اصلاح چاہتے ہیں تو قوم کو تعلیم یافتہ بنائیے، اس کے بعد تمام مسائل اپنے آپ حل ہوجائیں گے۔

۶ جنوری ۱۹۹۵ کو گوہاٹی سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ یہ سفر انڈین ایرلائنز کی فلائٹ نمبر ۸۹۰ کے ذریعہ طے ہوا۔ گوہاٹی سے واپسی میں جہاز کے نیچے بادلوں کی گہری چادر نہیں تھی۔ ہمارا جہاز بنگلہ دیش کے اوپر سے اڑتے ہوئے ہندستانی علاقہ میں

داخل ہوا۔ میں نے جہاز کے نیچے دیکھا تو درختوں سے ڈھکا ہوا بنگلہ دیش ایک جنگل کی تصویر پیش کر رہا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ ایک ہندستانی جرنلسٹ مسٹر چنچل سرکار نے حال میں بنگلہ دیش کا سفر کیا تھا۔ اس کے بعد ان کا ایک تبصرہ دہلی کے انگریزی اخبار پانیر میں چھپا تھا۔ مسٹر سرکار نے بنگلہ دیش میں مختلف قسم کے لیڈروں سے ملاقات کی۔ کوئی اسلامی سیاست کی بات کرتا تھا اور کوئی سیکولر سیاست کی۔ مگر ہر ایک کا اسلام بھی الگ تھا اور ہر ایک کا سیکولرزم بھی الگ۔ چنانچہ انھوں نے بنگلہ دیش کو ایک سیاسی جنگل (political jungle) سے تعبیر کیا تھا۔

یہ صرف بنگلہ دیش کی بات نہیں۔ اختلافات کی کثرت نے آج پوری مسلم دنیا کو اسی طرح کی صورت حال میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اتحاد کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ قوم کے پاس ایک کتاب اور ایک قرآن ہو۔ اگر لوگوں کا مزاج بگڑا ہوا ہو تو وہ ایک کتاب کی سیکڑوں تعبیر کرکے دوبارہ قوم کو افکار کے ایک جنگل میں بھٹکا دیں گے۔

اس قسم کی صورت حال ہمیشہ نااہل لوگوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ بولنے کے قابل لوگوں کے لئے جتنا بولنا ضروری ہے اتنا ہی ضروری یہ ہے کہ وہ لوگ جو بولنے کے قابل نہیں ہیں وہ نہ بولیں۔ ۹۹ آدمی چپ رہیں اسی وقت ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی بولے اور اس کا بولنا لوگوں کے لئے مفید ثابت ہو۔

گوہاٹی سے دہلی تک ڈھائی گھنٹہ کا سفر تھا۔ درمیان میں کچھ اخبارات پڑھے۔ آسام ٹریبون (گوہاٹی) کے شمارہ ۶ جنوری ۱۹۹۵ کے صفحہ اول پر ریاستی حکومت کے حوالے سے یہ خبر تھی کہ تریپورہ میں قبائلی جنگجوؤں (tribal militants) کے پاس جدید ہتھیاروں (sophisticated arms) کی بھاری مقدار پہنچ گئی ہے۔ وہ انسانوں کے اوپر ان ہتھیاروں کا تجربہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ اخبار کی اسی اشاعت میں کئی خبریں تھیں کہ اچانک موٹر سائیکل پر کچھ لوگ آئے اور بے قصور لوگوں پر فائر کرکے بھاگ گئے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو علاقہ کی آزادی کے نام پر اپنی متشددانہ تحریک چلا رہے ہیں۔ اس

کے بجائے اگر وہ یہ کہیں کہ ہم نراج اور بدامنی لانے کے لئے تحریک چلا رہے ہیں تو یہ زیادہ صحیح بات ہوگی۔

بدقسمتی سے ٹھیک یہی حال مسلم دنیا کا ہے۔ جگہ جگہ مسلم نوجوانوں نے اسلام کے نام پر ہتھیار اٹھا رکھا ہے۔ حالاں کہ ان کی اس تشددانہ تحریک سے آج بھی صرف قتل وخون برآمد ہو رہا ہے اور آئندہ بھی اس سے قتل وخون ہی کا تحفہ لوگوں کو ملنے والا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال افغانستان ہے۔

ہوائی جہاز کے نیچے جو پہیہ ہوتا ہے وہ ایئرپورٹ پر جہاز چلانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جب جہاز اوپر اٹھ کر اڑنے لگتا ہے تو پہیہ اندر کی طرف اٹھا لیا جاتا ہے۔ میں نے پائلٹ سے پوچھا کہ لینڈنگ کے وقت اگر آپ پہیہ کو نیچے گرانا بھول جائیں تو کیا ہوائی جہاز حادثہ کا شکار ہو جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ معمولی نقصان تو ہوگا، لیکن اس سے کوئی بڑا حادثہ پیش نہیں آئے گا۔ انھوں نے بتایا کہ لینڈنگ کے وقت پہیہ نیچے گرانے کے لئے یاددہانی کے مختلف انتظامات کئے گئے ہیں۔ نئے ہوائی جہازوں میں کمپیوٹرائزڈ ریکارڈنگ ہوتی ہے جو لینڈنگ کے وقت پائلٹ کو ان الفاظ میں مسلسل وارننگ دیتی ہے:

Check your landing gear, check your landing gear.

میں نے پوچھا کہ جہاز کا پہیہ (لینڈنگ گیر) اوپر کیوں اٹھا لیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید اونچی بلڈنگ یا پہاڑ وغیرہ کی ٹکر سے بچانے کے لئے ایسا کیا جاتا ہوگا۔ انھوں نے بتایا کہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ پہیہ دس فٹ یا اس سے بھی زیادہ لمبا ہوتا ہے۔ اگر پہیہ نیچے لٹکا رہے تو اس کی وجہ سے ہوائی رکاوٹ پیدا ہو جائے گی:

Drag is created if the landing gear is down.

جہاز تقریباً دو گھنٹہ لیٹ ہو کر ساڑھے پانچ بجے شام کو دہلی پہنچا۔ جہاز کے اندر اعلان میں مسافروں سے کہا گیا کہ اس دیری کے کارن آپ کو جو اسوبیدھا ہوئی اس کے لئے ہم چھما چاہتے ہیں۔ تاہم انڈین ایئرلائنز کے لئے یہ ایک معمول کی بات ہو چکی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں لوگوں کو طرح طرح کی زحمتیں پیش آتی ہیں۔

آج کے اخبار میں ایک خبر یہ تھی کہ حکومت ہند کے ایک ذمہ دار نے کہا کہ ترقی کا فائدہ ہمیں ہندستان کے عام شہریوں تک پہنچانا ہے۔ میں نے سوچا کہ ہوائی جہاز میں جو لوگ سفر کرتے ہیں وہ تو خواص کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ پھر پچاس سال کی قومی حکومت کے باوجود جب ترقی کا فائدہ ملک کے خواص تک بھی پوری طرح نہیں پہنچا تو ملک کے عوام تک ترقی کا فائدہ پہنچانے کے لئے آخر کتنا زیادہ وقت درکار ہوگا۔

۶ جنوری ۱۹۹۵ کی شام کو میں دہلی واپس پہنچا۔

میرٹھ کا سفر

۱۱ اپریل ۱۹۹۶ء کو دہلی سے میرٹھ (سردھنہ) کا سفر ہوا۔ یہ سفر بذریعہ کار تین گھنٹہ میں طے ہوا۔ میرے ساتھ مولانا محمد عرفان قاسمی اور حکیم محمد کلیم صاحب شریکِ سفر تھے۔

دہلی کی سڑکوں پر چلتے ہوئے جگہ جگہ دکھائی دیا کہ صفائی کا کوئی اہتمام نہیں۔ مجھے یاد آیا کہ یکم مارچ ۱۹۹۶ء کو سپریم کورٹ آف انڈیا نے تمام متعلق محکموں کے نام حکم جاری کیا تھا کہ وہ دہلی میں صفائی کا اعلیٰ اہتمام کریں اور اس کو خوب صورت شہر بنائیں۔ (ملاحظہ ہو اقتباس ذیل) مگر دہلی آج بھی مجھے ویسی ہی نظر آئی جیسی وہ عدالت عالیہ کے اس حکم سے پہلے تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام اور سرکاری عملہ دونوں میں قانون کی تعمیل کا جذبہ موجود نہیں۔ پھر حکم جاری کرنے سے کیا فائدہ۔

عدالتِ عالیہ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ گھروں گھروں میں پلاسٹک کی تھیلیاں فراہم کی جائیں۔ لوگ ان تھیلیوں میں اپنے گھر کا کوڑا ڈال کر اسے سڑک پر رکھ دیں اور صبح کو صفائی کرمچاری اسے اٹھالیں۔ اس طرح سڑکوں پر کوڑا پھیلنا بند ہو جائے گا۔ میں جس کالونی میں رہتا ہوں اس کی سوسائٹی نے ایک سال پہلے اپنی کالونی کے لیے یہی فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ گھر والے اپنا کوڑا

New Delhi, March 1: The Supreme Court today ordered all civic agencies to have Delhi cleaned and scavenged every day and directed both the state and the Union government to make it a "greener, cleaner place to live in". The directions were passed by a division bench comprising Mr Justice Kuldip Singh and Mr Justice Saghir Ahmed on a public interest litigation filed by a lawyer, B. L. Wadhera. The court approved an experimental scheme of the Municipal Corporation of Delhi and the New Delhi Municipal Committee for distribution of polythene bags for garbage disposal to the citizens of selected localities. The court directed that these garbage disposal bags should be collected in cleaned receptacles provided by the civic agencies to prevent garbage from being spread all over the garbage collection centres and on the nearby roads. The Central Pollution Control Board and the Delhi Pollution Committee will have the responsibility to ensure that this garbage disposal system works efficiently by deputing inspection teams and reporting the situation to the apex court every two months.

The Times of India, New Delhi, March 2, 1996.

پلاسٹک کی تھیلیوں میں بند کر کے سڑک پر رکھنے لگے۔ مگر جلد ہی یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ کیوں کہ ردی پلاسٹک اکھٹا کرنے والے لڑکے یہ کرتے تھے کہ وہ کوڑا سڑک پر الٹ دیتے اور تھیلی لے کر بھاگ جاتے۔

کچھ عرصہ سے ہندستان میں ایک چیز کی بڑی دھوم ہے۔ اس کو جوڈیشیل ایکٹوزم کہا جاتا ہے۔ اخباروں میں ہر روز اس کے بارہ میں کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا ہے۔ اس کے دفاع میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اے ایم احمدی نے دہلی میں ایک تفصیلی لکچر دیا۔ یہ لکچر دو قسطوں میں جوڈیشیل ایکٹوزم (Judicial Activism) کے عنوان سے ٹائمس آف انڈیا ۲۷ - ۲۸ فروری ۱۹۹۶ میں چھپ چکا ہے۔

اس طویل تحریر میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جوڈیشیل ایکٹوزم یا عدالت کا جارحانہ رول (aggressive role) دستوری طور پر درست ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ قانونی نہیں ہے بلکہ عملی ہے۔ بہتر سماج یا بہتر سماج کی تشکیل میں قانون کا رول بہت جزئی ہے۔ سب سے زیادہ جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ عوام کے اندر احساس ذمہ داری ہو اور انتظامی عملہ دل سے اصلاحی احکام کے نفاذ کے لیے آمادہ ہو۔ اس لیے پہلا کام اصلاح افراد کا ہے نہ کہ اصلاح حکومت کا۔

موجودہ زمانہ میں جگہ جگہ اسلام کے نام پر انقلابی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ ان کو عام طور پر اسلامی بیداری (صحوۃ اسلامیہ) کہا جاتا ہے۔ یہ تحریکیں اسلام کی سیاسی تعبیر سے متاثر ہیں اور ہر جگہ "اسلامی قانون نافذ کرو" کے مطالبہ کا ہنگامہ جاری کیے ہوئے ہیں۔ مگر عملی اعتبار سے وہ اسی طرح بے سود ہے جس طرح ہندستان کا موجودہ جوڈیشیل ایکٹوزم۔

ہندستان میں عدالتی فیصلوں کے نفاذ کے لیے اس کے موافق حالات موجود نہیں ہیں۔ اس لیے فیصلوں کے باوجود عملاً ان کا نفاذ نہیں ہوتا۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں کسی بھی مسلم ملک میں وہ موافق سماجی فضا موجود نہیں ہے جو اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے بالفرض اگر کسی ملک میں نام نہاد اسلام پسندوں کا قبضہ ہو جائے اور وہ حکومتی اداروں کے ذریعہ اسلامی قانون کا نفاذ شروع کر دیں تو وہاں اسلام کا قانون تو نافذ نہیں ہو گا،

البتہ اسلام لوگوں کی نظر میں مضحکہ ضرور بن جائے گا۔

کچھ دیر کے بعد ہماری گاڑی دہلی سے نکل کر یوپی کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ اسی کے ساتھ ہم لوگ ایک اور ذہنی سفر میں مشغول ہو گئے۔ پورے راستہ میں سوال وجواب کی صورت میں مختلف موضوعات پر ہماری گفتگو جاری رہی۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے موجودہ زمانہ میں انسان کو ایسی خودکار سواریاں دے دی ہیں کہ آدمی سفر بھی کرے اور عین اسی وقت وہ اپنا دوسرا کام بھی جاری رکھے۔

مولانا محمد عرفان قاسمی نے کہا کہ آج کل سفر بہت آرام دہ ہو گیا ہے۔ کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ چنانچہ سفر میں کبھی کبھی طبیعت چاہتی ہے کہ قصر کرنے کے بجائے مکمل نماز پڑھی جائے تاکہ شکر ادا کیا جا سکے۔ انھوں نے کہا کہ اس معاملہ میں گنجائش بھی ہے۔ کیوں کہ امام شافعیؒ کے نزدیک قصر ایک رخصت ہے، اور مکمل نماز پڑھنا افضل ہے۔ پھر سفر میں پوری نماز پڑھنا کیسا ہے۔

میں نے کہا کہ حدیث میں اس کی بابت آیا ہے کہ تلك صدقة تصدّق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته (یہ اللہ کی طرف سے ایک صدقہ ہے، پھر تم اللہ کے صدقہ کو قبول کرو) اس سے معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں جو تقابل ہے وہ رخصت اور افضل کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ رخصت اور صدقہ کے درمیان ہے۔ یعنی آپ اگر رخصت پر عمل نہ کریں تو آپ افضل کو نہیں لیں گے بلکہ خدا کے ایک عطیہ کو لینے سے انکار کریں گے۔ اور خدا کے عطیہ کو نہ لینا نعوذ باللہ خدا کی ناقدری ہے نہ کہ کوئی افضل عمل۔

پھر میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے بیشتر اقدامات تباہ کن ثابت ہوئے۔ اس کا سبب غلط تقابل کی یہی فکری غلطی تھی۔ مثلاً پچھلے دو سو سال میں مسلمانوں نے ساری دنیا میں جہاد کے نام پر بار بار ٹکراؤ کیا۔ لیکن ہر بار صرف تباہی اور بربادی ان کے حصہ میں آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے جہاد کا تقابل فرار سے کیا۔ وہ سمجھے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ فرار کو چھوڑ کر جہاد کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ حالاں کہ ایسے تمام مواقع پر اصل تقابل جہاد اور اعداد میں تھا۔ یعنی ٹکراؤ نہ کر کے ان کے لیے پرامن تعمیر کے میدان میں سرگرم ہونے کا موقع تھا۔ لیکن غیر ضروری طور پر وہ ٹکراؤ اور محاذ آرائی میں الجھ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پرامن تعمیر کے نہایت

قیمتی مواقع استعمال ہونے سے رہ گئے۔

ایک سوال یہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں عبادت گزاری بڑھ رہی ہے۔ مگر اخلاقیات میں تنزل ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ ایک دین داری وہ ہے جو معرفت کی سطح پر ہو۔ دوسری دین داری وہ ہے جو عادت کی سطح پر ہو۔ آج کل کے لوگ زیادہ تر عادت کے تحت عبادت گزار بن گئے ہیں۔ لیکن اخلاق میں تبدیلی عارفانہ عبادت گزاری سے پیدا ہوتی ہے، اس کو آپ شعوری عبادت گزاری بھی کہہ سکتے ہیں۔ عادت کے تحت جو عبادت گزاری کی جائے اس سے ایک قسم کی نفسیاتی تسکین تو مل سکتی ہے مگر اس میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ آدمی کے اندر اخلاقی انقلاب پیدا کر سکے۔

ایک سوال یہ تھا کہ تنقید اور تنقیص میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ تنقید وہ ہے جو متعلق شخص کے اعلان کردہ یا ثابت شدہ موقف پر ہو۔ اور تنقیص وہ ہے جس کا خود آدمی نے اعلان یا اقرار نہ کیا ہو۔ اس مفہوم میں تنقید پوری طرح جائز ہے، اور تنقیص مکمل طور پر ناجائز۔

مثلاً الرسالہ میں صبر و اعراض کی پالیسی پر زور دیا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص صبر و اعراض کا نام لے کر الرسالہ پر تنقید کرے تو یہ اپنے طریقہ کے اعتبار سے ایک جائز تنقید ہوگی۔ لیکن اگر کوئی شخص الرسالہ کی طرف یہ بات منسوب کرے کہ "الرسالہ بزدلی سکھاتا ہے" اور پھر اس پر تنقید کرے تو یہ تنقید نہیں بلکہ تنقیص ہوگی۔ کیوں کہ ہم نے کبھی ایسا نہیں کہا کہ مسلمان بزدلی کی روش اختیار کرلیں۔ یہ دوسروں کی گھڑی ہوئی بات ہے نہ کہ ہمارا اپنا اعلان کردہ موقف۔

انھوں نے دوبارہ کہا کہ غیبت کی تعریف حدیث کی کتابوں میں یہ آئی ہے کہ پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کی جائے۔ یہی تعریف خود تنقید پر بھی صادق آتی ہے، کیوں کہ تنقید میں بھی پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کی جاتی ہے، حالاں کہ غیبت حرام ہے اور تنقید کو جائز ہونا چاہیے۔ پھر دونوں کے درمیان حد فاصل کیا ہے۔

میں نے کہا کہ محض غیر موجودگی کی بنا پر کوئی تنقید غیبت نہیں بن جاتی۔ ہمارے مدارس میں اپنے امام کے سوا دوسرے اماموں کے مسلک پر تنقید کی جاتی ہے۔ حالاں کہ زیر تنقید امام وہاں موجود نہیں ہوتا۔ مگر کوئی بھی اس کو غیبت نہیں قرار دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ غیبت کا تعلق اس

برائی سے ہے جو آدمی کا اپنا اعلان کردہ مسلک نہ ہو۔ جب کہ تنقید کا تعلق اس مسلک سے ہوتا ہے جس کا آدمی نے پہلے ہی علی الاعلان اقرار کر رکھا ہے۔ پھر اس کو غیبت کیسے کہا جائے گا۔

جو لوگ تنقید کو برا مانتے ہیں وہ اس لیے نہیں کہ ہمارے مسلک کا ذکر کیوں کیا۔ بلکہ ان کی ناراضگی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارے مسلک پر تنقید کیوں کی۔ اگر ان کے مسلک کا صرف تذکرہ کیا جائے تو وہ خوش ہوں گے۔ البتہ جب اس پر تنقید کی جاتی ہے تو وہ ناخوش ہوجاتے ہیں۔ گویا ان کی ناخوشی تذکرۂ مسلک پر نہیں ہے بلکہ تنقید مسلک پر ہے۔ جب کہ غیبت وہ ہے جس میں خود تذکرہ ہی آدمی کے لیے ناخوشی کا باعث بن جائے۔

"جو لوگ پیغامِ حق سننے سے پہلے مر گئے ان کا انجام کیا ہوگا" ــــــ اس سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ یہ غیب کی باتیں ہیں، اور ہم غیب کے بارہ میں رائے قائم کرنے کے مکلف نہیں۔ میں نے کہا کہ پچھلے زمانہ میں لوگوں نے اس طرح کے سوالات پر بہت زیادہ بحثیں کیں۔ مگر یہ تمام تر فلسفہ کے زیر اثر تھا نہ کہ اسلام کے زیر اثر۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کے بارہ میں قرآن میں ہے کہ تم کو علم قلیل (الاسراء ۸۵) دیا گیا ہے، اس لیے تم ان پر بحث نہ کرو۔ مگر قدیم فلسفہ کا موقف چوں کہ یہ تھا کہ انسان علم کلی تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے اس کے زیر اثر لوگ اس طرح کے سوالات میں تعمق کرنے لگے۔

مگر موجودہ زمانہ کا غالب علم سائنس ہے۔ اور سائنس نے اس قسم کے تمام سوالات کا آخری جواب دے دیا ہے۔ سائنس نے بتایا کہ انسان اپنی محدودیت کی بنا پر علم کلی تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اس کو اجمالی علم پر قناعت کرنا چاہیے۔ اس تحقیق کے بعد اب قرآن کا موقف ہی خود علمی اعتبار سے بھی واحد صحیح موقف بن گیا ہے (تفصیل کے لیے: مذہب اور سائنس)

جب بھی بذریعہ روڈ میں کسی سفر پر جاتا ہوں تو ایک منظر ضرور دکھائی دیتا ہے۔ یہ سڑک کے کنارے الٹی ہوئی گاڑیاں ہیں۔ اس سفر میں بھی ایک ٹرک الٹا ہوا نظر آیا۔ یہ منظر خود دہلی کے اندر تھا۔

اس طرح کے روڈ ایکسیڈنٹ پہلے زمانہ میں نہیں ہوا کرتے تھے۔ یہ صرف جدید مشینی دور کی خصوصیت ہے۔ سست رفتار سواریوں کا دور اس قسم کے حادثات سے تقریباً خالی تھا۔ جب

دنیا میں تیز رفتار سفر کا زمانہ آیا تو ساری دنیا کی سڑکوں پر ایکسیڈنٹ ہونے لگے۔ ہر چیز کے کچھ ایڈوانٹج ہیں اور کچھ ڈس ایڈوانٹج۔ موجودہ دنیا میں معیاری زندگی کی تعمیر ممکن نہیں۔

سواریوں کو گزارنے کے لیے سڑک کا طریقہ بہت قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے۔ مثلاً موریہ سلطنت جس کا زمانہ چوتھی صدی قبل مسیح ہے، اس کے حکمرانوں نے ایسی سڑکیں بنائی تھیں جن کے ذریعہ وہ اپنی پوری سلطنت میں سفر کر سکیں۔ واضح ہو کہ ان کی سلطنت ایک طرف دریائے سندھ سے دریائے برہم پتر تک اور دوسری طرف ہمالیہ پہاڑ کے کناروں سے لے کر وندھیا چل تک پھیلی ہوئی تھی۔ تاہم جدید طرز کی پختہ (hard-surfaced) سڑکیں اس وقت بنائی گئیں جب کہ صنعتی انقلاب آیا اور مشینی سواریاں انسانوں کو لے کر دوڑنے لگیں۔

انڈیا میں سڑکوں (یا ریل کی پٹریوں) کا معیار ابھی ترقی یافتہ ملکوں کے معیار سے بہت کم ہے۔ مغربی ملکوں میں گاؤں اور قصبات میں جو سڑکیں میں نے دیکھی ہیں ویسی سڑکیں یہاں دہلی اور بمبئی میں بھی ابھی تک پائی نہیں جاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ انڈیا میں نہ ریل زیادہ تیز چلائی جا سکتی ہے اور نہ کار۔

راستہ میں ہمیں میرٹھ سے گزرنا تھا۔ یہاں پہنچ کر ہم لوگ کچھ دیر کے لیے ٹھہرے۔ اور میرٹھ کے کچھ افراد سے ملاقاتیں کیں۔

میرٹھ کے محمد یامین صاحب کونسلر (Tel. 24610) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے بارہ میں کچھ مسلمان بدظن ہیں اور وہ آپ کو بھاجپا کا آدمی سمجھتے ہیں۔ مثلاً آپ لکھنؤ کے ایک بھاجپائی مسلمان کی دعوت پر لکھنؤ گئے اور وہاں ان کے زیرانتظام گنگا پرشاد میموریل ہال میں تقریر کی۔

یہ ۱۶ اپریل ۱۹۹۵ کی بات ہے۔ محمد یامین صاحب نے گفتگو کے دوران بتایا کہ اتفاق سے اس وقت وہ لکھنؤ میں تھے اور وہ گنگا پرشاد میموریل ہال کے مذکورہ پروگرام میں شریک ہوئے۔ میں نے کہا کہ پھر تو فیصلہ بہت آسان ہے، آپ بتائیے کہ وہاں میں نے اپنی تقریر میں کیا کہا۔ انھوں نے کہا کہ شروع سے آخر تک سب آپ نے قرآن و حدیث کی باتیں کہیں۔ انھوں نے یہ بھی اقرار کیا کہ وہاں اسٹیج پر نہ بھاجپا کا بینر تھا اور نہ اس کا اور کوئی نشان موجود تھا۔

میں نے کہا کہ پھر یہ تو خوش ہونے کی بات ہے کہ وہاں کے اسٹیج سے لوگوں کے سامنے قرآن و حدیث کی بات پیش کی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں مشرکوں کے بلانے پر ان کے یہاں گئے۔ مدینہ میں آپ یہود کے بلانے پر ان کے پاس گئے۔ یہی ہمیشہ علماء کا طریقہ رہا ہے۔ اسلام ایک دعوت ہے۔ اور جہاں اور جس اسٹیج پر بھی اسلام کی بات کہنے کا موقع ملے گا وہاں اس کو پیش کیا جائے گا۔ یہ ایک قابل قدر بات ہے نہ کہ قابل اعتراض بات۔

محمد یامین صاحب نے میلہ نوچندی میگزین (۱۹۹۳) کی ایک کاپی دی۔ اس میں میرٹھ کے بارہ میں کئی مضامین تھے۔ مگر سب کے سب ادبی زبان میں تھے۔ کوئی بات بھی محدّد انداز میں نہ تھی۔ اس لیے میں ان سے زیادہ فائدہ حاصل نہ کر سکا۔

یہ صرف ایک میگزین کی بات نہیں۔ یہی اردو زبان کا عام مزاج ہے۔ بدقسمتی سے اردو زبان کا مزاج اقبال جیسے شاعروں اور ابوالکلام آزاد جیسے ادیبوں نے بنایا ہے۔ یہ لوگ لفاظی اور حقیقت نگاری کا فرق نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے حقیقت کو بھی لفظی گل کاری کے انداز میں بیان کیا۔ یہی روایت اردو زبان میں عام طور پر قائم ہوگئی۔ ایک جدید تعلیم یافتہ شخص نے کہا: الرسالہ پہلا پرچہ ہے جو اردو زبان میں سائنٹفک اسلوب کو رواج دے رہا ہے۔

اردو کا مسئلہ غلط رول ماڈل کا مسئلہ ہے۔ انگریزی زبان میں نیوٹن سے پہلے شاعروں اور ادیبوں کو رول ماڈل کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے بعد جب سائنس کا غلبہ ہوا تو سائنس داں رول ماڈل بن گئے۔ اس طرح انگریزی زبان ادبی اسلوب کے دور سے نکل کر سائنسی اسلوب کے دور میں داخل ہوئی۔ اردو میں اس قسم کا انقلابی عمل پیش نہیں آیا۔ کچھ شاعر اور ادیب جو ایک بار اردو میں رول ماڈل کی حیثیت اختیار کر گئے تھے، سائنسی انقلاب جیسا کوئی واقعہ پیش نہ آنے کی بنا پر، آج بھی وہی اشخاص لوگوں کا رول ماڈل بنے ہوئے ہیں۔ اس صورتِ حال کو بدلے بغیر اردو کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

تقریباً تین گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ہم لوگ سردھنہ پہنچے جو کہ ضلع میرٹھ کا ایک قصبہ ہے۔ سب سے پہلے ہماری گاڑی تحصیل والی مسجد پر رکی۔ یہاں عصر کی نماز تیار تھی۔ چنانچہ یہاں عصر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی گئی۔ یہ ایک چھوٹی مسجد ہے جو قصبہ کے بیرونی حصہ میں واقع ہے۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ سردھنہ میں ۳۶ مسجدیں ہیں۔

کسی نئی بستی میں داخل ہونے کا یہی اسلامی طریقہ ہے۔ اگر وقت ہو گیا ہو تو پہلے مسجد میں داخل ہو کر مقامی مسلمانوں کے ساتھ باجماعت نماز ادا کی جائے۔ اور اگر نماز کا وقت نہیں ہے تو دو رکعت سنت پڑھ کر اپنے لیے اور بستی والوں کے لیے دعا کریں، اس کے بعد بستی کے اندر جائیں۔

نماز عصر سے فراغت کے بعد ہم لوگ روانہ ہو کر جناب تسلیم احمد خان ایڈووکیٹ کی رہائش گاہ پہنچے جہاں مجھے قیام کرنا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ہماری پہلی ملاقات ۱۹۹۱ میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے بار بار وہ مجھے سردھنہ آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ پانچ سال بعد اب اس کی تکمیل ہوئی۔

یہاں کئی لوگ جمع ہو گئے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ آج کل ہر انسان پریشانی میں ہے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ میں خاموش تھا۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا: اس لیے کہ وہ پڑوسی کو سُکھی دیکھنا نہیں چاہتا۔

تسلیم احمد صاحب کے اندر ایک عجیب صفت ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں یا سنتے ہیں وہ ان کو مستقل طور پر یاد ہو جاتا ہے۔ سردھنہ کے ہزاروں آدمیوں کے نام ان کو ولدیت کے ساتھ یاد ہیں۔

اس قسم کے حافظہ کو انگریزی میں فوٹوگرافک میموری کہا جاتا ہے۔ایک صاحب سے ایک بار بات ہو رہی تھی۔گفتگو کے دوران مولانا آزاد کا ذکر ہوا۔میں نے کہا کہ ان کو تو فوٹوگرافک میموری حاصل تھی۔انھوں نے میری تصحیح کرتے ہوئے کہا: فوٹوجینک میموری۔انھوں نے انگلش لٹریچر سے فرسٹ کلاس ایم اے کیا تھا۔وہ سمجھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہی صحیح ہے۔میں خاموش رہا۔چند دن کے بعد انھوں نے ٹیلی فون پر بتایا کہ تصویری حافظہ کے لیے فوٹوجینک کا لفظ نہیں ہے۔اس کے لیے فوٹوگرافک میموری ہی ہے، جیسا کہ آپ نے کہا تھا۔

"انگریزی داں" طبقہ میں اس طرح کا اعتراف عام ہے۔لیکن "عربی داں طبقہ" میں یہ اعتراف اتنا کم ہے کہ کم از کم میں نے ابھی تک اس کا تجربہ نہیں کیا۔

تسلیم احمد خان ایڈووکیٹ کی یادداشت ایسی ہے کہ ملاقات ہوتے ہی انھوں نے کمپیوٹر کی طرح ہر بات تاریخ وار بتانا شروع کر دیا ـــــ ۱۹۸۷ سے میں مسلسل الرسالہ کا قاری ہوں۔ آپ سے میری پہلی ملاقات ۵ مئی ۱۹۹۱ کو دہلی میں ہوئی تھی۔دوسری ملاقات پونہ میں ۳ اکتوبر ۱۹۹۲ کو ہوئی۔تیسری ملاقات ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۴ کو دہلی میں ہوئی۔اس ملاقات میں آپ نے سردھنہ آنے کے لیے ۱۱ نومبر ۱۹۹۴ کی تاریخ مقرر کر دی تھی۔مگر چند دن بعد آپ کا خط آگیا کہ آپ اس تاریخ کو نہ آسکیں گے۔

انھوں نے اور بھی کئی باتیں یاد دلائیں۔مثلاً انھوں نے کہا کہ پونہ کی مجلس میں آپ سے سوال کیا گیا تھا کہ لاتور کے علاقہ میں جو زلزلہ آیا ہے، کیا وہ عذاب الٰہی ہے۔اس کے جواب میں آپ نے کہا کہ وہ عذاب نہیں ہے بلکہ تنبیہ ہے۔شرعی اصطلاح میں عذاب آنے کے لیے اہل حق کی ہجرت شرط ہے۔مشترک آبادی میں کبھی عذاب مستأصل نہیں آتا۔

مغرب کی نماز قریب کی مسجد میں پڑھی گئی۔اس کا نام مسجد کرہ نوا بان ہے۔بوڑھے امام صاحب نے یہ آیت تلاوت کی: والسماء بنیناها بأید وإنا لموسعون (الذاریات ۴۷)

اس آیت میں پھیلتی ہوئی کائنات کی فلکیاتی حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے (تذکیر القرآن ۲/۳۰-۶۲۹) تاہم اس میں ایک بالواسطہ اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو توسیع پسند ہے نہ کہ جمود۔مگر اس توسیع سے مراد سیاسی یا جغرافی توسیع نہیں ہے بلکہ فکری توسیع

یعنی غور و فکر کے ذریعہ آدمی اپنے ذہن کو مسلسل وسیع کرتا رہے۔ اس پر کبھی ٹھہراؤ کی وہ حالت نہ آئے جس کو فکری جمود کہا جاتا ہے۔

جناب تسلیم احمد ایڈووکیٹ کے مکان پر دیر تک نشست رہی۔ اس میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔

مسجد کرہ نوابان کے امام مولانا بدرالاسلام قاسمی نے بتایا کہ نہر سوئز کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد وہاں جو لڑائی ہوئی، اس وقت وہ دارالعلوم دیوبند میں موجود تھے۔ اس زمانہ میں مصری حکومت نے عربی زبان کے دو استاد دیوبند بھیجے تھے۔ ان میں سے ایک شیخ عبدالمنعم النمر تھے۔ وہ آئے تو ان کے چہرہ پر داڑھی نہیں تھی۔ دیوبند کی فضا میں انھوں نے داڑھی رکھ لی۔ دو سال کی مدت پوری کرنے کے بعد جب وہ واپس جانے لگے تو دہلی ہوائی اڈہ پر پہنچ کر انھوں نے اپنی داڑھی منڈوادی۔ اور اس کا بال اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: خذوا لحیتکم یا اهل الهند (اے ہندستان والو، یہ اپنی داڑھی لو)

امام صاحب قاری محمد طیب صاحب کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ قاری طیب صاحب نے ایک بار کہا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے پاس ایک شخص آیا اور سوال کیا کہ حضرت، یزید کیسا تھا۔ مولانا نانوتوی نے ایک لمحہ سوچا اور اس کے بعد کہا: شاعر بہت اچھا تھا۔

میں نے کہا کہ یہ جواب کا وہی طریقہ ہے جس کو انگریزی میں ٹالنے والا جواب (evasive reply) کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سوال کرنے والا کوئی ایسا سوال کر دیتا ہے جس کا براہ راست جواب دینا کسی وجہ سے مناسب نہیں ہوتا۔ ایسے موقع کے لیے جواب کا یہ طریقہ بہت موزوں اور مفید ہے۔

ایک اور صاحب نے بتایا کہ ایک بار الکشن کے زمانہ میں کانگرس والوں کو معلوم ہوا کہ فلاں حلقۂ انتخاب میں تبلیغ والے بہت ہیں۔ اور اگر مولانا یوسف صاحب (سابق امیر تبلیغ) کہہ دیں تو تمام تبلیغی لوگ کانگرس کو ووٹ دے دیں گے۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ کون شخص ہو جو مولانا یوسف صاحب سے یہ بات کہے۔ کسی کانگرسی نے بتایا کہ اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں آدمی مولانا حسین احمد مدنی ہیں۔ چنانچہ طے ہوا کہ کچھ لوگ مولانا حسین احمد مدنی کے پاس جائیں اور ان سے

درخواست کریں کہ وہ مولانا یوسف سے یہ بات کہہ دیں۔

یہ خبر تبلیغی مرکز میں پہنچ گئی۔ یہاں مشورہ ہوا کہ کیا کرنا چاہیے۔ ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ مولانا یوسف صاحب تبلیغی سفر پر باہر چلے جائیں تاکہ مولانا حسین احمد مدنی صاحب سے ان کی ملاقات ہی نہ ہو سکے۔ مولانا یوسف صاحب نے کہا کہ اس کے بجائے کیوں نہ ہم لوگ مل کر دعا کریں کہ اللہ ہمیں اس آزمائش سے بچا لے۔ اس کے مطابق لوگ دعا میں مشغول ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کا وفد جب دیوبند جا کر مولانا حسین احمد مدنی سے ملا اور مذکورہ درخواست کی تو انھوں نے وفد کو یہ جواب دے دیا : بھائی، مولوی یوسف ایک کام میں لگے ہوئے ہیں، ہم کیوں ان کے کام میں خلل ڈالیں۔

دعا مخصوص اوقات میں کچھ یاد کیے ہوئے الفاظ کی تکرار نہیں، دعا ایک عمل اور ایک طریق زندگی ہے۔ دعا بجائے خود ایک تدبیر ہے۔ آدمی جب کسی معاملہ میں دعا کرتا ہے تو اس طرح وہ اپنے اس یقین کو پختہ کرتا ہے کہ اس دنیا کا اصل مالک خدا ہے۔ یہاں جو کچھ ہوگا اسی کے اذن سے ہوگا۔ اس کے اذن کے بغیر یہاں کچھ ہونے والا نہیں۔ دعا ایک پکار ہے جو اس لیے ہوتی ہے کہ بندہ کے عجز کی تلافی کے لیے اس کا خدا اس کی حمایت پر آجائے۔

اسی کے ساتھ یہ کہ آدمی جب اپنے کسی معاملہ میں دعا کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک نیا انسان بناتا ہے۔ وہ اپنی نفسیات کو مثبت سمت میں متحرک کرتا ہے۔ وہ اپنی سوچ کو خارج رخی سوچ بنانے کے بجائے اس کو داخل رخی سوچ بناتا ہے۔ اس طرح دعا آدمی کی اندرونی قوتوں کو جگا کر اس کو پہلے سے زیادہ طاقت ور انسان بنا دیتی ہے۔

زیادہ عمر کے ایک صاحب نے بتایا کہ میں اپنی ماں کا ایک ہی لڑکا تھا۔ وہ میرے لیے دعا کیا کرتی تھیں کہ یا اللہ، تو میرے بیٹے کو دولت دینا تو پہلے اس کے استعمال کا سلیقہ دینا۔ میں نے کہا کہ یہ پہلے زمانہ کی ماؤں کا طریقہ تھا۔ آج کے ماں باپ کا حال یہ ہے کہ وہ اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان کا بیٹا خوب دولت کمائے۔ اس کے سوا کسی اور چیز کے بارہ میں نہ انھیں کوئی خبر ہے اور نہ کوئی تڑپ۔

ایک صاحب نے بعض اردو اخبارات کے حوالے سے عالمی سیاست پر ایک تیز و تند

تبصرہ کیا۔ میں نے کہا کہ محض اردو اخبارات پڑھ کر عالمی سیاست کے بارہ میں اس طرح کی رائے قائم کرنا درست نہیں، کیوں کہ اردو اخبارات نہایت ناقص ہیں۔ محدود اقتصادی ذرائع کی بنا پر وہ زیادہ لائق افراد کو اپنے ادارہ کے لیے حاصل نہیں کر پاتے۔ تمام اردو اخبارات میں تیسرے درجہ کے کارکن بھرے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اردو اخبارات ناقص خبر رسانی کا ذریعہ بن گئے ہیں۔

اس کی ایک دل چسپ مثال یہ ہے کہ ابھی چند دن پہلے دہلی کے سب سے بڑے اردو اخبار کے شمارہ ۴ اپریل میں ایک ہوائی جہاز کی تصویر چھپی۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ برطانیہ میں بنائے گئے اس جہاز کی پرواز سات سال بعد شروع ہوگی۔ میں حیران ہوا کہ جب جہاز بن کر تیار ہو چکا ہے تو آخر وہ اتنی زیادہ دیر کے بعد کیوں اپنی پرواز شروع کرے گا۔ اس کے بعد یہی خبر جب ٹائمس آف انڈیا میں دیکھی تو اصل حقیقت معلوم ہوئی۔ اگلے صفحہ پر دونوں اخباروں کی تصویر مع کیپشن نقل کی جارہی ہے۔

ایک مجلس میں مدارس کے طرز تعلیم کے بارہ میں گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ مفسر طنطاوی جوھری (۱۲۸۷-۱۳۵۸ ھ) نے لکھا ہے کہ قرآن میں فقہی نوعیت کے مسائل کے بارہ میں صرف ۱۵۰ آیتیں ہیں۔ جب کہ کائنات میں غور و فکر کے بارہ میں ۷۵۰ آیتیں ہیں۔ اس لحاظ سے دینی تعلیم کے مدارس میں علوم کائنات کا غلبہ ہونا چاہیے۔ مگر موجودہ مدارس میں علوم کائنات سرے سے پڑھائے ہی نہیں جاتے۔ جب کہ فقہی مسائل کا یہ حال ہے کہ وہی پورے تعلیمی نظام پر غالب آگئے ہیں۔ حتیٰ کہ اس میں قرآن و حدیث کو بھی فقہ کے تابع کر دیا گیا ہے۔

ایک گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ آج کل لوگوں کا حال یہ ہے کہ ایک شخص پیسہ کما کر شاندار گھر بنائے تو وہ اس کے اوپر لکھ دیتا ہے کہ ھذا من فضل ربی۔ مگر یہ قرآنی آیت کا ادھورا استعمال ہے۔ اگر کوئی لکھے تو اس کو پوری آیت لکھنا چاہیے۔ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا کلمہ ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو غیر معمولی اقتدار عطا فرمایا تھا، اس پر آپ نے کہا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے جانچے کہ میں شکر کرتا ہوں یا میں ناشکری کرتا ہوں (النمل ۴۰)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی نعمت حقیقۃً فضل کے لیے نہیں ہوتی بلکہ وہ ابتلاء (آزمائش)

SUPERJUMBO: An artist's view of the Airbus A3XX which will be capable of carrying 600 passengers. It could be in service within the next seven years, it was announced in London on Wednesday.

کے لیے ہوتی ہے۔ دنیوی نعمت کو پاکر آدمی کے اندر ناز کی کیفیت پیدا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے اندر مسئولیت کا احساس مزید اضافہ کے ساتھ جاگنا چاہیے۔

قرآن کی اس آیت سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ دولت کا جو معاملہ ہے وہی اقتدار کا معاملہ بھی ہے۔ اقتدار بھی بطور نوازش نہیں ملتا بلکہ بطور ابتلاء ملتا ہے۔ اگر آج آپ کے پاس دولت ہے، اور کل دوسرا آدمی دولت مند ہوجائے تو آپ اس کو غاصب قرار دے کر اس کے خلاف چیخ پکار نہیں کرتے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ میرے پاس بھی دولت خدا کی طرف سے آئی تھی اور اس کے پاس بھی دولت خدا ہی کی طرف سے آئی ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ اقتدار کا بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اقتدار یا زمینی خلافت کسی قوم کا ابدی حق نہیں، جس طرح دولت کسی گروہ کا ابدی حق نہیں۔ اللہ تعالیٰ مصلحتِ امتحان کے تحت خلافت ارضی کبھی ایک قوم کو دیتا ہے اور کبھی دوسری قوم کو۔ سیاسی اقتدار بھی بہت سے امتحانی پرچوں میں سے ایک پرچہ ہے۔ جس طرح دوسرے پرچے باری باری سب کو دیے جاتے ہیں، اسی طرح سیاسی پرچہ بھی ایک کے بعد دوسرے کو ملتا ہے، اور اسی طرح قیامت تک چلتا رہے گا۔

یہ تبدیلی کسی صلیبی یا صہیونی سازش کے تحت نہیں ہوتی بلکہ براہ راست خدائی قانون کے تحت ہوتی ہے (آل عمران ۲۶) اس بنا پر انسان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اس کو قبول کرے۔ اس کا تقاضا ہے کہ خلافت ارضی جب ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف منتقل ہو تو محروم گروہ ایسا نہ کرے کہ اس کو سازش اور غصب کا معاملہ قرار دے کر اس کے خلاف ہنگامہ آرائی شروع کر دے۔ ایسا کرنا محرومی پر ہلاکت کے اضافہ کے ہم معنی ہوگا۔ اس کے بجائے محروم گروہ کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ اس کو خدا کا فیصلہ مان کر اس پر راضی ہوجائے۔

اس معاملہ میں خدائی فیصلہ کو مان لینا محروم قوم کے لیے عبادت کے ہم معنی ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے اندر حقیقت پسندی پیدا ہوگی۔ اس کے اندر مثبت فکر جاگے گا۔ وہ اپنی کمزوریوں کو دور کرنے میں لگ جائے گا۔ اس کے افراد سیاست کے سوا دوسرے خالی میدانوں میں سرگرم عمل ہوجائیں گے۔ اس کی یہ روش عین ممکن ہے کہ خدا کی رحمت کو دوبارہ متوجہ کرے اور دوبارہ اس کے حق میں سیاسی اقتدار کا فیصلہ کر دیا جائے۔

سردھنہ کے سید برہان الدین صاحب (ایم اے معاشیات) کی عمر اب ۶۵ سال ہوچکی ہے۔ انھوں نے پاکستان سمیت بہت سے ملکوں کا سفر کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مشاہدات بتاتے ہوئے کہا : مسلمانوں کو نہ یہود سے خطرہ ہے، نہ عیسائیوں سے اور نہ ہندوؤں سے۔ مسلمانوں کو خطرہ صرف اپنی ذات سے ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا گلا کاٹنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تباہی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

مجلس میں کئی لوگ موجود تھے۔ میں نے سوال کیا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی خاص کمزوری کیا ہے جس نے انھیں دوسری قوموں سے پیچھے کر دیا۔ مولانا محمد رضوان قاسمی نے کہا : "میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس کا سبب شعور کی کمی ہے"۔ یہ دور مقابلہ کا دور ہے۔ مگر مسلمان اپنی بے شعوری کی وجہ سے اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ وہ بس دوسروں کی شکایت کرنے میں اپنا وقت ضائع کرتے رہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ میں زیادہ تر غیر مسلموں کی باتیں ہوتی ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بات آپ تجربہ کے تحت نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ کسی سے سن کر کہہ رہے ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ آپ اپنے پاس سے کوئی رسالہ نکالیے۔ یہ بات خود ان کے گھر پر ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ گھر کے اندر سے الرسالہ کا شمارہ ستمبر ۱۹۹۱ لے کر آئے۔

اس کی ورق گردانی کی تو اس میں غیر مسلموں کے دو حوالے تھے۔ مثلاً صفحہ ۸ پر پروفیسر مارگولیتھ کا وہ حوالہ جس میں انھوں نے اصحاب رسولؐ کو ہیروؤں کی قوم کہا ہے۔ میں نے کہا کہ الرسالہ میں غیر مسلموں کے حوالے غیر مسلموں کے خیالات کی تبلیغ کے لیے نہیں ہوتے، وہ اسلام کی صداقت بیان کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ عربی زبان کا ایک مثل ہے کہ فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمن دیں (الفضل ما شهدت به الاعداء)

میں نے کہا کہ اس اعتبار سے غیر مسلموں کا حوالہ تو ایک خوبی کی بات ہے، اور ماضی سے لے کر حال تک کے تمام علماء اسلام اس قسم کے حوالے دیتے رہے ہیں۔ پھر یہ تو خوشی کی بات ہے، نہ یہ کہ اس پر اعتراض کیا جائے۔

سردھنہ میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۳۰ ہزار ہے۔ مگر ان کا اپنا کوئی قابلِ ذکر تعلیمی ادارہ

نہیں۔ جب کہ جینیوں کی تعداد صرف چار ہزار ہے۔ اس کے باوجود وہ تعمیری و تعلیمی میدان میں بہت آگے ہیں، یہاں ان کے تین تعلیمی ادارے چل رہے ہیں۔ لڑکیوں کا انٹر کالج، لڑکوں کا انٹر کالج، اور جونیر ہائی اسکول۔ اس کے علاوہ جین ہاسپٹل ہے جس میں آپریشن وغیرہ کا معقول انتظام ہے۔ ان حضرات کی باقاعدہ ایک سوسائٹی "جین ملن سوسائٹی" کے نام سے ہے جس کے تحت یہ تمام تعمیری کام انجام دیے جاتے ہیں۔ یہی حال عیسائی حضرات کا ہے وہ بھی تعلیمی میدان میں بہت آگے ہیں۔ ان کا تعلیمی معیار بھی کافی اونچا ہے۔

جین فرقہ اور عیسائی فرقہ کے خلاف ملک میں کوئی تعصب کی فضا نہیں۔ جبکہ مسلمان شکایت کرتے ہیں کہ ان کے خلاف بڑے پیمانہ پر تعصب پایا جاتا ہے۔ اس کی کم ازکم ایک وجہ یہ ہے کہ جین اور عیسائی جہاں ہیں وہاں وہ لوگوں کے لیے نفع بخش بن کر رہتے ہیں۔ مسلمانوں میں عام طور پر یہ مزاج نہیں پایا جاتا۔ دونوں کے معاملہ میں فرق کا اصل سبب یہی ہے۔

میرٹھ کے ایک گاؤں کا قصہ مجھے معلوم ہے۔ یہاں ایک خاندان ہے، اس کا مزاج یہ ہے کہ نہ کسی سے کچھ لو اور نہ کسی کو کچھ دو۔ بس اپنے کام سے کام رکھو۔ ان لوگوں نے اپنی زمینوں میں محنت کر کے کافی پیسہ کمایا۔ مزید زمینیں خریدیں۔ نیا مکان بنایا۔ بستی میں ان کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہوگئی۔ گاؤں کے ماحول میں وہ شہر کی طرح رہنے لگے۔

اس کے نتیجہ میں گاؤں والوں میں حسد کا جذبہ پیدا ہوا۔ اگرچہ وہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے تھے مگر دوسرے انھیں تکلیف دینے کے درپے ہو گئے۔ پہلے یہ کیا کہ ان کے ٹیوب ویل سے موٹر نکال لے گئے۔ ان کا ٹریکٹر غائب کر دیا۔ اس طرح کی حرکتوں سے ان کا کچھ نہیں بگڑا تو اب یہ کیا کہ خود اپنے اندر کے ایک بوڑھے کو قتل کر کے مذکورہ خاندان کے تمام لوگوں کو فوجداری کیس میں پھنسا دیا۔ حتی کہ اس خاندان کے ایک ہونہار نوجوان کو قتل کر ڈالا۔ وغیرہ۔

یہ بلاشبہ کمینہ پن ہے۔ مگر اس طرح کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنی تعمیر کے ساتھ ایک اور تدبیر یہ کرنا چاہیے کہ وہ شر پسندوں کے شر سے کس طرح بچے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ آدمی جہاں رہے وہ دوسروں کے لیے نفع بخش بن کر رہے۔ دوسروں کو فائدہ پہنچا کر وہ انھیں اپنا احسان مند بنائے رہے۔ لوگوں کے شر سے بچنے کا یہ سب سے زیادہ آسان اور موثر طریقہ ہے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ اس معاملہ میں دونوں فریق کے درمیان جو جھگڑے ہوئے اس میں دونوں کا ملا کر تقریباً ۲۰ لاکھ روپے کا نقصان ہوا ہے۔ ہندستان کی کوئی بستی یا کوئی شہر نہیں جہاں مسلمانوں کے درمیان اس قسم کے نزاعات نہ پائے جاتے ہوں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر بے شمار جماعتیں، ادارے اور تنظیمیں قائم ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں جو مسلمانوں کے ان باہمی جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش کر رہی ہو۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اسلام کے نام پر ہر جگہ دھوم مچی ہوئی ہے، مگر اسلام کے لیے کسی گہرے اور دور رس کام کا کہیں وجود نہیں۔

مولانا محمد رضوان قاسمی یہاں ایک تعلیمی ادارہ چلا رہے ہیں۔ انھوں نے ایک کاغذ دیا۔ اس پر سردھنہ کے ایک صاحب کا تاثر حسب ذیل الفاظ میں لکھا ہوا تھا:

"الرسالہ پڑھنے کے بعد تمثیل احمد خان نے کہا کہ مولانا صاحب یہ کام تنہا نہیں کرتے بلکہ ایک ٹیم ہے جن کو مولانا نے مختلف میگزین اور کتابیں پڑھنے پر مامور کیا ہے۔ کسی کا کام اردو اخبار پڑھنا ہے۔ کسی کا کام عربی چیزیں پڑھنا۔ اور کسی کا کام انگریزی ڈائجسٹ وغیرہ پڑھنا۔ یہ لوگ حسب ہدایت واقعات کی تعیین کر کے مولانا کو پیش کر دیتے ہیں۔ مولانا ان واقعات کو مذہب پر منطبق کر کے الرسالہ کے لیے مضامین تیار کر دیتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ کام تنہا ایک آدمی نہیں کر سکتا۔ البتہ کمپوٹر کر سکتا ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ مسلسل چالیس سالہ مطالعہ کے بعد مولانا نے الرسالہ نکالنا شروع کیا ہے۔ تاہم وہ مطمئن نہیں ہوئے انھوں نے کہا کہ الرسالہ میں اس قدر معیاری کتابوں کے حوالے ہوتے ہیں کہ ان کو یاد رکھنا اور ترتیب دینا ایک آدمی کا کام ہی نہیں"۔

ایک اور صاحب تھے۔ انھوں نے کہہ دیا کہ الرسالہ تو سب کا سب سرقہ ہوتا ہے۔ ایک آدمی اتنی باتیں نہیں لکھ سکتا۔ اس لیے یقین ہے کہ وہ ادھر اُدھر سے سرقہ کر کے ان کو مرتب کر دیتا ہے۔

میں نے کہا کہ الرسالہ دعا کی طاقت سے نکل رہا ہے مگر لوگ دعا کی طاقت کو نہیں جانتے۔ عام طور پر لوگ صرف رسمی دعاؤں سے واقف ہیں۔ یا وہ کسی بزرگ کے دعائیہ جلسہ میں شریک ہو کر آمین کہنے کو دعا سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ دعا اس سے بلند تر ایک شے ہے۔ دعا دراصل خدا کی یافت ہے۔ دعا معرفتِ حق کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ دعا انسان کا حقیقتِ اعلیٰ کے ساتھ

اتصال ہے۔ دعا گویا خزانۂ قدرت تک ایک انسان کی رسائی ہے۔ دعا جب اپنے کمال پر پہنچتی ہے تو انسان کا سینہ تجلیاتِ الٰہی کا ہبط بن جاتا ہے۔ یہ دعا جب وجود میں آتی ہے تو کسی انسان کے لیے وہ لمحہ آجاتا ہے جس کی بابت حضرت مسیح نے فرمایا: مانگو تو پاؤ گے، دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔

ایک صاحب نے اپنا قصہ بتایا کہ سڑک پر میں ایک سواری کی زد میں آکر گر پڑا اور بیہوش ہو گیا۔ اٹھا تو میں اسپتال میں تھا۔ معلوم ہوا کہ کچھ ہندوؤں نے مجھ کو زخمی حالت میں دیکھا تو فوراً اپنی گاڑی میں لٹاکر انھوں نے مجھے اسپتال پہنچایا اور میری ہر طرح مدد کی۔ یہ قصہ بتاکر انھوں نے کہا: انسانیت ابھی زندہ ہے۔ شرپسندوں میں کچھ خیر پسند بھی موجود ہیں۔

میں نے کہا کہ بہت سے مسلمانوں کے ساتھ اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ وہ جب ان واقعات کو بیان کرتے ہیں تو ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ انسانیت ابھی زندہ ہے۔ اس کا مطلب بظاہر یہ ہوتا ہے کہ بروں کی بھیڑ میں کچھ اچھے افراد بھی ہیں۔ مگر یہ صحیح بات نہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کی بنا پر ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ غیر مسلم سب ہمارے دشمن ہو گئے ہیں۔ اگر کوئی دشمن نہیں ہے تو وہ استثناء ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ ہر آدمی فطرت کے اعتبار سے خیر پسند ہے۔ ہر ایک کے اندر انسانیت موجود ہے۔ فسادات کا سبب دشمنی نہیں۔ فسادات کا سبب وقتی اشتعال ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کچھ جذباتی قسم کے لوگ اپنی کسی نادانی سے ایک بھیڑ کے نفس امارہ کو جگا دیتے ہیں۔ اور وہ بھڑک کر فساد پر اتر آتے ہیں۔ اگر ہم اپنے جذباتی لوگوں میں صبر و تحمل کی صفت پیدا کر دیں تو اس ملک سے ہمیشہ کے لیے فسادات کا خاتمہ ہو جائے۔ اور ہر آدمی خیر پسند دکھائی دینے لگے۔

ایک نوجوان نے کہا کہ مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ میں نے اس کی ڈائری میں حسب ذیل نصیحت لکھ دی: زندگی کا راستہ ہموار راستہ نہیں۔ یہاں اونچ نیچ دونوں ہی آتے ہیں۔ کامیاب وہ ہے جو اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر ہمت نہ ہارے، جو ہر حال میں یکساں عزم کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے۔

۱۱ اپریل کو عشاء کی نماز سردھنہ کی جامع مسجد میں پڑھی۔ یہاں نماز کے بعد تقریر کا پروگرام

تھا، نماز کے بعد بیشتر لوگ ٹھہر گئے۔ میں نے اپنی تقریر میں نماز کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی۔ خاص طور پر یہ بتایا کہ نماز کی اصل اسپرٹ کیا ہے اور ملت کی تعمیر میں اس کا رول کیا ہے۔

تقریر کے بعد دیر تک مصافحہ ہوا۔ میں سمجھتا تھا کہ مصافحہ کے بعد لوگ چلے جائیں گے۔ مگر کافی لوگ اس کے بعد دوبارہ بیٹھ گئے۔ چنانچہ سوال و جواب کی صورت میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اسی دوران کئی اخبار کے رپورٹر آگئے۔ ان میں ہندی اخبار کے رپورٹر بھی تھے اور اردو کے رپورٹر بھی۔ آخر میں ان کے سوالات کا جواب دیا۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ زندگی کا ایک سادہ اصول یہ ہے کہ جتنی محنت اتنی کامیابی۔ یہ اصول اتنا عام ہے کہ اس کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ سب سے بڑی اخلاقی صفت اپنے خلاف سوچنا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں میں سرے سے موجود نہیں۔

۱۱ اپریل ۱۹۹۶ کی شام کو یہاں میں نے جو تقریر کی تھی، اس کی رپورٹ اس علاقہ کے اخباروں میں بھی چھپی۔ اس وقت کچھ اخباروں کے نمائندے بھی موجود تھے جنھوں نے تقریر کے آخر میں سوالات کیے۔ چوں کہ ۲۷ اپریل کو اور پھر ۳، ۷ مئی ۱۹۹۶ کو لوک سبھا اور ریاستی اسمبلیوں کے الکشن ہونے والے ہیں، اس لیے الکشن کی بابت بھی سوالات کیے گئے۔ اگلے صفحہ پر ہندی روزنامہ امراجالا (۱۲ اپریل ۱۹۹۶) کی شائع شدہ رپورٹ نقل کی جارہی ہے۔

ایک مجلس تھی۔ میں زیادہ تر لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ ہر ایک سے سوال کرکے اس کے اپنے میدان کے تجربات پوچھ رہا تھا۔ اس درمیان میں محمد حنیف صاحب نے سوال کیا کہ الرسالہ آپ اکیلے ہی لکھتے ہیں، یا اور بھی کچھ لکھنے والے لوگ ہیں، میں نے جواب دیا کہ میں اکیلا ہی لکھتا ہوں۔ مگر اس کی تیاری میں بہت لوگ شامل ہیں۔ حتی کہ آپ لوگ بھی اس میں شریک ہیں۔ کیوں کہ جیسا کہ آپ نے دیکھا، میں ہر ایک سے اس کے دائرہ کی معلومات لیتا رہتا ہوں۔ اس طرح میرے پاس بہت سے لوگوں کے تجربات اکٹھا ہو جاتے ہیں اور میں ان کے ذریعہ الرسالہ کو مرتب کرتا رہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ الرسالہ اگرچہ ایک شخص کے قلم سے لکھا جاتا ہے مگر اس میں تنوع اتنا زیادہ

ہوتا ہے کہ وہ ۲۰ سال سے نکل رہا ہے۔ مگر آج تک لوگوں کی دل چسپی اس سے ختم نہیں ہوئی۔ اس کا نیا پن مسلسل باقی ہے۔

رات ہوئی تو سردھنہ کے آسمان پر ستارے جگمگاتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ کسی شخصیت کی بڑائی بتانا ہو تو کہا جاتا ہے کہ وہ ایسا تھا جیسے ستاروں کے درمیان سورج۔ مگر یہ صرف ایک ادبی اسلوب ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سورج خود بھی ایک ستارہ ہے۔ مزید یہ کہ فلکیاتی تقسیم میں سورج نسبتاً ایک چھوٹا ستارہ سمجھا جاتا ہے :

The Sun is classified as a dwarf star.

آسمان کے بیشتر ستارے سورج سے بہت زیادہ بڑے ہیں۔ معلوم کیا گیا ہے کہ ان کی جسامت (Volumes) سورج کے مقابلہ میں ایک ملین سے لے کر دس ملین گنا تک زیادہ ہے۔

رات کے وقت ستاروں کا خوب صورت منظر اب دہلی جیسے شہروں میں گویا معدوم ہو گیا ہے۔ دہلی میں فضائی کثافت اتنی زیادہ بڑھ چکی ہے کہ وہاں اب نہ سانس لینے کے لیے

मौलाना वहीदुद्दीन खान ने सरधना में कहा: समृद्धि का आधार मेहनत है, आरक्षण नहीं

अमर ऊजाला ब्यूरो: सरधना, १२ अप्रैल। जाने-माने विचारक मौलाना वहीदुद्दीन खान ने कहा कि आरक्षण की अपेक्षा मेहनत त्याग के बल पर अर्जित सफलता आत्मिक, सामाजिक, आर्थिक समृद्धि प्रदान करती है। नगर के बुध बाजार स्थित जामा मस्जिद में आज इशा की नमाज के बाद अकीदतमंदों को खिताब करते हुए उन्होंने नमाज की विस्तृत व्याख्या भी की। उन्होंने कहा कि नमाज सदर बनने के जज्बों से बचाती है। उन्होंने इत्तेहाद पर बल देते हुए कहा कि यह सबसे बड़ी ताकत है और इसमें जिस प्रकार नमाज के दौरान हम एक इमाम के पीछे सभी मुकतदी होते हैं, उसी प्रकार हमें सदर बनने की होड़ से स्वयं को उबारना चाहिए। बाद में मुस्लिम बुद्धिजीवियों व पत्रकारों के सवालों का जवाब देते हुए उन्होंने कहा कि इस्लाम यह सिखाता है कि दुश्मन से भी अच्छा सुलुक करो। जो आज दुश्मन है, कल वह मित्र बन जाएगा। भाईचारा कायम करने के मिशन पर निकले मौलाना वहीदुद्दीन खान ने कहा कि इस्लाम के मुताबिक हम दुनिया भर में फैले हैं, अपनी बात को रखने के दो माध्यम हैं। एक दादागिरी, दूसरा दाई (देने वाला)। दादागिरी के बल पर कोई मिशन कामयाब नहीं हो सकता। आरक्षण संबंधी प्रश्न के उत्तर में मौलाना ने कुरान और हदीस की रोशनी में कहा कि हम तुमसे कोई अज्र नहीं मांगते। मांगना अपने आप को हकीर बनाना है। तरक्की का राज मेहनत है, आरक्षण नहीं। इंसान अपनी ताकत को पहचाने। हदीस में आया है कि रिजक का नब्बे फीसदी हिस्सा तिजारत में है। सीताराम केसरी (कल्याण मंत्री) के मुस्लिमों को आरक्षण देने की सिफारिश पर टिप्पणी करते हुए उन्होंने कहा कि 'वो बेवकूफ बना रहे हैं और हम बेवकूफ बन रहे हैं।' उन्होंने और कुरेदने पर कहा कि वे (कांग्रेस) १९४७ से लगातार हुकूमत कर रहे हैं, अब से पूर्व आरक्षण क्यों नहीं दिया गया। मौलाना ने आर्थिक मजबूती के लिए सहकारी समितियां बनाकर सहयोग का आह्वान किया। चुनाव के दौरान किस पार्टी का समर्थन किया जाए, सवाल के जवाब में उन्होंने कहा कि सही मायने में हालात ये है कि यदि चुनाव अच्छे-बुरे में हो तो बेशक अच्छे को चुनने के लिए कहा जा सकता है, लेकिन यहां तो चुनाव 'मिस्टर करप्ट' व 'श्री भ्रष्ट' के बीच है।

خالص ہوا ہے، اور نہ دیکھنے کے لیے فطرت کے آسمانی مناظر۔
موجودہ دنیا میں انسان دو مسئلے کے درمیان ہے۔ اگر تمدنی ترقی حاصل کی جائے تو فطرت کا حسن رخصت ہو جاتا ہے۔ اور اگر فطرت کا ماحول اختیار کیا جائے تو وہ صرف تمدنی ترقیوں سے محرومی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ دونوں خوبیاں اپنی کامل اور معیاری صورت میں جنت کے سوا کہیں اور ملنے والی نہیں۔

۱۲ اپریل کو نماز فجر سے فراغت ہوئی تو معلوم ہوا کہ صبح کی چائے جناب محمود علی خان صاحب کے مکان پر ہے۔ یہاں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ چنانچہ دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

محمد حنیف ملتانی صاحب نے بتایا کہ ایک بار وہ ٹرین میں سفر کر رہے تھے، راستہ میں نماز کا وقت آ گیا۔ انھوں نے جگہ بنا کر نماز ادا کی۔ ایک ہندو مسافر نے دیکھ کر کہا کہ آپ تو بڑے دھارمک معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ بھی تو پورے دھارمک ہیں۔ دیکھئے، آپ ہردوار سے گنگا جل لیے چلے آ رہے ہیں، اور جب پانی پینا ہوتا ہے تو اسی کو پیتے ہیں۔ اس کے بعد مذہب پر گفتگو ہونے لگی۔

محمد حنیف صاحب نے کہا کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ آدمی قیمتی چیز میں ساجھا گوارا نہیں کرتا۔ پھر خدا تو سب سے زیادہ قیمتی ہے، اس میں ساجھا کیسے گوارا ہو سکتا ہے۔ اس طرح مثالوں کے ذریعہ انھوں نے شرک اور توحید کا فرق بتایا۔ اور کہا کہ شرک کا عقیدہ فطرت کے خلاف ہے اور توحید کا عقیدہ عین فطرت کے مطابق۔ مذکورہ ہندو مسافر نے بڑے دھیان سے سنا اور آخر میں کہا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاط کس طرح بجائے خود اشاعتِ اسلام کا ذریعہ ہے، کسی بھی طرح اگر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اختلاط بڑھ جائے تو دعوت کا عمل اپنے آپ جاری ہو جائے گا۔

۱۹۴۷ کے بعد میرٹھ میں بار بار فرقہ وارانہ فساد ہوتا رہا ہے۔ سردھنہ اس سے صرف ۲۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، مگر یہاں کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ میں نے لوگوں سے اس

کی بابت گفتگو کی۔ بظاہر یہ سمجھ میں آیا کہ اس کا سبب عمومی اختلاط ہے۔ سردھنہ کی آبادی ۶۰ ہزار ہے۔ اس میں تقریباً نصف ہندو اور نصف مسلمان ہیں۔ یہاں کے کاروبار کی نوعیت ایسی ہے کہ بار بار دونوں فرقہ کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ اس طرح تقریباً سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں، یہی سماجی اور کاروباری میل ملاپ اس فرق کا اصل سبب ہے۔

میں نے کہا کہ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اختلاط مانع فساد ہے۔ اگر صرف اتنا ہو جائے کہ دونوں فرقوں کا اختلاط بڑھ جائے تو فساد کے اسباب اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

۱۹۸۷ میں میرٹھ میں بہت بڑا فساد ہوا۔ اس کے بعد سردھنہ میں کسی نے شرارت کی اور مسجد میں خنزیر کا گوشت ڈال دیا۔ اس طرح کے کچھ واقعات کیے گئے تاکہ سردھنہ میں بھی فساد برپا ہو جائے۔ مگر یہاں کے لوگ ٹھنڈے مزاج کے ہیں۔ وہ مشتعل نہیں ہوئے۔ اس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے بڑے لوگ اکٹھا ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ جو ہو چکا وہ ہو چکا، اب اس کو آگے بڑھنے نہیں دینا ہے۔ چنانچہ یہ چنگاری آغاز ہی میں بجھ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرٹھ میں سخت نقصان ہوا۔ مگر سردھنہ میں کوئی نقصان نہیں ہوا۔ یہاں کے مسلمان آج ترقی کر رہے ہیں بزنس اور تعلیم دونوں میدانوں میں وہ آگے بڑھ رہے ہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ ۱۹۸۷ میں میرٹھ فساد کے موقع پر سردھنہ کے تین مسلمانوں کو قریب کے گاؤں کساولی میں مار ڈالا گیا جب کہ وہ وہاں باغ کی رکھوالی کر رہے تھے۔ مگر سردھنہ کے مسلمان اس پر مشتعل نہیں ہوئے۔ اس طرح ایک طرف مجرمین کو قانونی سزا ملی اور دوسری طرف سردھنہ فساد کی مصیبت سے بچ گیا۔

۱۲ اپریل کی صبح کو شیخ محمد حنیف ملتانی (۵۱ سال) کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ غیر رسمی انداز میں دیر تک لوگوں سے گفتگو ہوتی رہی۔ سردھنہ میں ہندو اور مسلمان دونوں زیادہ تر بزنس کے میدان میں ہیں۔ تاہم ایک صاحب کے الفاظ میں "مسلمان تو زیادہ تر مزدوری کرتے ہیں۔ ہندو بزنس میں ہم سے بہت آگے ہیں"۔ میں نے سبب پوچھا تو ایک صاحب نے کہا: میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کا سبب صرف علم کی کمی ہے۔

دعوت کے نفوذ کی راہ میں اصل رکاوٹ یہی کشیدگی ہے نہ کہ مسلمانوں کی عملی کوتاہی۔ اگر مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان معتدل تعلقات قائم ہو جائیں تو فوراً ہی دعوت کا عمل شروع ہو جائے گا۔ اس کے بعد دونوں کا باہمی اختلاط ہی دعوت کے لیے کافی ہو جائے گا جس طرح وہ پچھلے زمانوں میں ہوا تھا۔

ایک مسلمان نے کہا کہ کانفرنس میں آپ کی دونوں تقریریں امن و اخوت کے موضوع پر تھیں۔ آپ نے براہ راست اسلامی دعوت پیش نہیں کی۔ میں نے کہا کہ کانفرنس والوں کی طرف سے جو موضوع دیا گیا تھا، مجھ کو بہرحال اسی موضوع پر بولنا تھا۔ اگر میں خود ساختہ طور پر کسی اور موضوع پر بولنے لگتا تو وہ غیر متعلق (irrelevant) ہو جاتا۔ اور پھر اہل علم کی اس کانفرنس میں میری تقریر کی کوئی اہمیت نہ ہوتی۔

دوسری بات یہ کہ جس طرح براہ راست دعوت ایک کام ہے اسی طرح تقریب دعوت بھی ایک ضروری کام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقریب دعوت براہ راست دعوت کا پہلا مرحلہ ہے۔ اس حکمت کے بغیر دعوت کا کام موثر طور پر انجام نہیں دیا جا سکتا۔ یہی پیغمبرانہ سنت ہے اور فطرت کا تقاضا بھی۔

پونہ ہندستان کے ان چند مقامات میں سے ہے جس کی معتدل آب و ہوا کی بنا پر انگریزوں نے اس کو اپنی رہائش کے لیے پسند کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پونہ میں برٹش حکومت کے ابتدائی زمانہ ہی میں تعلیم کا رواج ہو گیا چنانچہ آج یہاں بہترین تعلیمی ادارے قائم ہیں اور عمومی طور پر لوگ تعلیم یافتہ نظر آتے ہیں۔ اسی کا یہ فائدہ ہے کہ پونہ کے لوگوں میں جو شعور اور ڈسپلن نظر آتا ہے وہ ملک کے دوسرے حصوں میں کم ملے گا۔ مثلاً یہاں کی سڑکوں پر یہ ایک عام منظر ہے کہ سواریاں اپنی اپنی لین میں چلتی ہیں۔ وہاں دہلی والی صورت نہیں ہے جہاں سڑکوں پر ہر آدمی ضابطہ کو توڑ کر اپنی گاڑی بھگانے کی کوشش کرتا ہے۔ پونہ کی سڑک پر آپ اپنی گاڑی چلا رہے ہوں اور اُوورٹیک کرنے کے لیے اپنا ہارن بجائیں تو اگلا آدمی فوراً ہی اپنی گاڑی کو کنارے کر لے گا۔ دلّی جیسے شہروں میں ایسا نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ فوراً ہی اس کو وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں جب کہ پونہ میں بار بار مجھے اس کا تجربہ ہوا کہ اس طرح کے مواقع پر کوئی آدمی اس کو وقار کا مسئلہ نہیں بناتا بلکہ سادہ طور پر صرف یہ دیکھتا ہے کہ میں ہلکی رفتار سے چل رہا ہوں اور پیچھے والا تیز رفتار سے تو مجھے کنارے ہٹ جانا چاہیے تاکہ پیچھے والا رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھ جائے۔

پونہ مرہٹوں کا تاریخی علاقہ ہے۔ یہ علاقہ نہ صرف نام کے اعتبار سے مہاراشٹر ہے بلکہ یہ علاقہ ہندستان

کے سب سے زیادہ اہم علاقہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بمبئی بھی اسی علاقہ کا ایک حصہ ہے جو ہندستان کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ دولت مند شہر سمجھا جاتا ہے۔

اورنگ زیب سے لے کر بعد کے تمام مسلم رہنما بشمول شاہ ولی اللہ دہلوی سب سے بڑا مسئلہ مرہٹوں کو سمجھتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ مرہٹوں کے زور کو توڑنا مسلم عہد کو دوبارہ واپس لانے کے ہم معنی ہے۔ یہ تصور بیک وقت دو اعتبار سے سطحی تھا۔ ایک یہ کہ حال کے اعتبار سے یہ دراصل انگریز تھے جو ہندستان میں مسئلہ بن رہے تھے۔ اور مستقبل کے اعتبار سے مراٹھا قوم مزید زور آور ہو کر دوبارہ اس علاقہ کی طاقت نمبر ایک بننے والی تھی ــــــ سطحی مشاہدہ اور گہری بصیرت میں کتنا زیادہ فرق ہے، اس کی ایک مثال اِس واقعہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ہمارے ہوٹل کے عین سامنے فرگوسن کالج ہے۔ یہ کالج سوا سو سال پہلے انگریزوں نے قائم کیا تھا۔ یہ تاریخی کالج بہت بڑے کیمپس میں واقع ہے۔ پونہ میں تعلیم کے عمومی رواج میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد اس وقت کے برٹش حکمرانوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ ہندستانیوں کو انگریزی زبان اور مغربی علوم پڑھائے جائیں۔ اس سے وہ یہ امید رکھتے تھے کہ ہندستانیوں کے باغیانہ جذبات ختم ہو جائیں گے اور وہ اس ملک میں آسانی کے ساتھ حکومت کر سکیں گے۔ اس فیصلہ کے تحت انھوں نے ملک کے مختلف مقامات پر انگریزی زبان اور مغربی تعلیم کے ادارے قائم کیے یا قائم کرنے میں مدد کی۔ انھیں میں سے ایک علی گڑھ کا تعلیمی ادارہ ہے جو اب مسلم یونی ورسٹی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آج اس ادارہ کو "عظمت ملی" کا نشان بتایا جاتا ہے۔ انگریزی دور میں جب سرسید اور ان کے ساتھیوں نے یہ تعلیمی ادارہ قائم کیا تو مسلمانوں کی طرف سے اس کی زبردست مخالفت کی گئی۔ یہ دراصل انگریز تھے جن کی براہ راست یا بالواسطہ مدد سے اس ادارہ کو قائم کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

پونہ کی سڑکوں سے بار بار گزرنا پڑا۔ اس دوران مختلف ایسے مناظر دیکھے جو کافی سبق آموز تھے۔

مثلاً ایک بار سڑک سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اسکول کے طلبہ جو سب کے سب یونیفارم میں تھے دو، دو کی قطار بنائے ہوئے لمبی لائن میں فٹ پاتھ سے گزر رہے ہیں۔ یہ ڈسپلن شمالی ہند کے شہروں میں کم نظر آتا ہے۔ اسی طرح اتوار کے دن یہی منظر دوبارہ نظر آیا۔ فٹ پاتھ پر بڑی

تعداد میں لوگ لمبی لائن میں خاموشی کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ چرچ جا رہے ہیں۔

اس واقعہ میں دو سبق ہے۔ ایک یہ کہ پوری سڑک پر بکھر کر چلنے کی صورت میں یہ لوگ دوسرے مسافروں کے لیے مسئلہ بن جاتے۔ انھوں نے اس کا آسان حل یہ دریافت کیا کہ فٹ پاتھ پر اپنی لمبی لائن بنا لیں۔ دوسرا سبق یہ تھا کہ جب دائیں بائیں پھیلنے کے مواقع نہ ہوں تو آگے اور پیچھے کی طرف لمبی لائن میں پھیل جاؤ۔ اس دنیا میں ہر مشکل کا سادہ حل موجود ہوتا ہے بشرطیکہ آدمی اپنی عقل کو استعمال کرے۔

اسی طرح دو بار یہ صورت پیش آئی کہ ہماری گاڑی بھیڑ میں کسی سائیکل یا اسکوٹر سے ٹکرا گئی۔ دونوں بار ایسا ہوا کہ سائیکل اور اسکوٹر والے نے پیچھے مڑ کر ایک بار دیکھا اور پھر خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ حالاں کہ اس قسم کا واقعہ اگر دلی میں ہو جائے تو دونوں میں تکرار ہونا لازمی ہے۔ حتی کہ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں میں ہاتھا پائی کی نوبت آجائے ـــــ ایک ہی ملک کے دو حصوں میں مزاج کا اتنا زیادہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ غالباً پالیٹکس ہے۔ دہلی جیسے علاقوں میں مدت سے پالیٹکس کی دھوم جاری رہی ہے جس نے لوگوں کو بے برداشت اور اشتعال پسند بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس پونہ جیسے علاقوں میں سیاست کا زور کم تھا۔ اس لیے وہاں کے لوگ عام طور پر متحمل اور تعمیر پسند ہیں۔

ڈاکٹر بارلنگے (۷۴ سال) پونہ کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ وہ انتہائی حد تک سیکولر اور غیر متعصب آدمی ہیں۔ ایک ملاقات میں انھوں نے کہا کہ پاکستان کی تجویز مسٹر جناح سے پہلے اقبال نے پیش کی تھی۔ اس اعتبار سے پاکستان کے اصل فکری قائد اقبال ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ یہ بات مجھے بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف اقبال نے یہ شعر کہا کہ :

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

مگر انھیں اقبال نے برصغیر ہند میں مذہب کے نام پر پارٹیشن کی تائید کی۔ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مستقل طور پر مذہبی بیر کا سبب بن گیا۔

میں نے کہا کہ یہ حقیقت ہے کہ مذہب محبت سکھاتا ہے وہ بیر نہیں سکھاتا۔ لیکن جب مذہب کو زر اور زمین کے مسئلہ سے جوڑا جائے گا تو ہمیشہ وہی الٹا نتیجہ نکلے گا جو برصغیر ہند میں نکلا۔ صحیح بات یہ ہے کہ مذہب کو صرف دل سے جوڑنا چاہیے۔ مذہب کا اصل کام آدمی کے اندر فکری اور روحانی انقلاب لانا ہے۔ بقیہ خارجی اصلاحات اپنے آپ انسانی انقلاب کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہیں۔ خارجی چیزوں کو اگر

براہ راست تحریک کا نشانہ بنایا جائے تو اس سے صرف فساد پیدا ہوگا نہ کہ اصلاح۔

ڈاکٹر سریندر بارلنگے نے یکم دسمبر کی صبح کو اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا تھا۔ میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچا۔ ڈاکٹر بارلنگے کی عمر تقریباً ۷۵ سال ہے اور وہ مہاتما گاندھی کے ساتھ کام کر چکے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ مہاتما گاندھی کے برت کو انگریز وائسرائے نے اپنی فوجوں سے زیادہ طاقت ور بتایا تھا۔ پھر مہاتما گاندھی نے ملک کے بٹوارے کو روکنے کے لیے اپنی یہ طاقت کیوں نہیں استعمال کی۔

ڈاکٹر بارلنگے نے کہا کہ مہاتما گاندھی سے براہ راست یہ سوال کیا گیا تھا انھوں نے جواب دیا کہ میرے برت کی طاقت اس وقت ہے جب کہ عوام میرے ساتھ ہوں۔ اور اب یہ حالت ہو چکی ہے کہ بٹوارے کے سوال پر دیش کے عوام میرا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں۔ ڈاکٹر بارلنگے نے کہا کہ اس وقت میں ایک مراٹھی اخبار 'انقلاب' نکالتا تھا۔ میں نے خود اپنے اخبار میں اس پر اداریہ لکھا تھا جس میں میں نے کہا تھا کہ —— پاکستان دو، آزادی لو۔ انھوں نے کہا کہ اس سوال پر اگر مہاتما گاندھی برت رکھتے تو یقیناً ان کا برت ناکام ہو جاتا۔ کیوں کہ عوام آزادی کے لیے مزید انتظار پر تیار نہ تھے۔

اس گفتگو کے بعد مجھے مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب (آزادئ ہند) یاد آئی۔ انھوں نے اس معاملہ پر جو کچھ لکھا ہے اس میں مذکورہ پہلو کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ انھوں نے ملک کی تقسیم کے معاملہ کو صرف چند سیاسی شخصیتوں کا معاملہ بنا دیا ہے وہ اس راز کو نہ سمجھ سکے کہ جمہوری دور میں کسی سیاسی شخصیت کی طاقت صرف اس وقت ہے جب کہ عوام کی بھیڑ اس کے ساتھ ہو۔ عوامی بھیڑ سے کٹتے ہی سیاسی لیڈر کا حال ایسا ہو جاتا ہے جیسے ترازو کے پلڑے پر گرام کا باٹ چھوڑ کر کوئنٹل کا باٹ اس سے اتار لیا جائے۔

۳۰ نومبر کو کانفرنس ختم ہو گئی مگر اس کے معاً بعد یکم دسمبر ۱۹۹۶ کو ایک خصوصی جلسہ ہوا۔ ایک بڑے پنڈال میں کافی لوگ اکٹھا تھے۔ یہ جلسہ ورلڈ پیس یونی ورسٹی کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ اس میں دوسرے ممتاز افراد کے علاوہ ڈاکٹر کلیس نوبیل (فاؤنڈر چیرمین، یونائٹیڈ ارتھ، نیویارک) فرانسین فورنیر (اسسٹنٹ ڈائرکٹر جنرل، یونیسکو، فرانس) شامل تھے۔

اس موقع پر دوسروں کے علاوہ میری بھی ایک تقریر ہوئی۔ میں نے کہا کہ امن کے مقصد کے لیے ایک تعلیمی اور تربیتی ادارہ قائم کرنا بہت خوش آیند بات ہے۔ میں دل سے بے حد امن پسند آدمی ہوں۔

چنانچہ امن وانسانیت کی باتیں کرتے ہوئے میرا دل بھر آیا۔ میں بے اختیار رونے لگا۔ میرے درد بھرے انداز کو دیکھ کر مجمع بھی رو پڑا۔ اختتام پر جب میں اسٹیج سے نیچے اترا تو بہت بڑی تعداد میں لوگ برکت لینے کے لیے میرے گرد اکٹھا ہو گئے۔ یہ انگریزی تقریر ان شاء اللہ انگریزی الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

یکم دسمبر ۱۹۹۶ کی شام کو پونہ سے واپسی ہوئی۔ یہ سفر بذریعہ انڈین ایر لائنز طے ہوا۔ پونہ ایرپورٹ پر اتفاقاً مسٹر ارن شوری سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی اسی جہاز سے دہلی جا رہے تھے۔ یہاں وہ مسٹر انا ہزارے سے ملاقات کے لیے آئے تھے جو اس وقت کرپشن کے خلاف برت رکھے ہوئے ہیں۔ مسٹر انا ہزارے ایک سچے دیش بھگت ہیں مگر جہاں تک ان کے برت کا تعلق ہے مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ کیونکہ ہندستان کا کرپشن کسی آدمی کے برت سے ختم نہیں ہو سکتا خواہ برت رکھنے والے خود مہاتما گاندھی کیوں نہ ہوں۔

مسٹر ارن شوری سے میں نے پوچھا کہ انڈیا میں آج کل جوڈیشل ایکٹیوزم زوروں پر ہے۔ بہت سے لیڈر عدالتی کارروائیوں کی زد میں ہیں۔ کیا اس سے ملک میں کچھ سدھار آئے گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ صرف جوڈیشل ایکٹیوزم سے تو کسی سدھار کی امید نہیں۔ ہمارے ملک کا کرپشن بہت گمبھیر ہے۔ پھر انھوں نے مسکرا کر کہا کہ کم از کم اس معاملہ میں اسلامی شریعت کو نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک کچھ لوگوں کو کڑی سزا نہ دی جائے حالات میں سدھار ہونے والا نہیں۔

واپسی میں جہاز کے اندر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے بتایا کہ میرا پونہ کا سفر ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ آج کل ہر روز جگہ جگہ کانفرنسیں ہو رہی ہیں، کیا ان کا کوئی فائدہ بھی ہے۔ میں نے کہا کہ ہر چیز کا ایک براہ راست فائدہ ہوتا ہے اور ایک بالواسطہ فائدہ۔ میں جانتا ہوں کہ ان کانفرنسوں کا براہ راست فائدہ نسبتاً کم ہے مگر ان کا بالواسطہ فائدہ بہت زیادہ ہے۔ اور اسی کے لیے میں ملک کے اندر اور ملک کے باہر ہونے والی کانفرنسوں میں شریک ہوتا ہوں۔ ان کانفرنسوں میں مختلف علاقوں اور مختلف ملکوں کے لوگ آتے ہیں۔ عام حالات میں اگر آپ ان سے ملنا چاہیں تو یہ ایک بے حد مشکل کام ہوگا۔ مگر کانفرنس میں یہ مختلف قسم کے لوگ ایک جگہ مل جاتے ہیں۔ ان سے ملاقات اور انٹرایکشن کی صورت میں جو فائدہ ہوتا ہے وہ بے حد اہم ہے۔ یہ فائدہ

کتابوں کے مطالعہ سے یا اورکسی ذریعہ سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کے انٹرایکشن سے انسانی تجربات میں اور عمومی طور پر انسانیت کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

اس کے علاوہ ان کانفرنسوں کے دوران تعمیری موضوعات کا جو چرچا ہوتا ہے اس سے ان کے حق میں ایک عمومی فضا بنتی ہے جو کسی اور طرح نہیں بن سکتی۔

یکم دسمبر ۱۹۹۶ کی شام کو دہلی واپسی ہوئی تو مغرب بعد کا وقت ہو چکا تھا۔ میرا یہ سفر خلاف معمول کافی لمبا تھا۔ اس سے پہلے میں صرف ایک دن کے لیے پونہ آیا تھا۔ مگر اس بار پورے آٹھ دن پونہ میں گزرے۔ میں نے سوچا کہ یہی زندگی کا معاملہ بھی ہے۔ کچھ لوگ دنیا میں بہت تھوڑا وقت گزار کر مر جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ وہ ہیں جو زیادہ لمبی عمر پاتے ہیں۔ تاہم اس معاملہ میں اصل اہمیت مدت کی نہیں ہے۔ اصل اہمیت یہ ہے کہ آدمی نے کیا پایا اور کیا سیکھا۔ کبھی زندگی کا ایک لمحہ اتنا قیمتی ہوتا ہے کہ وہ صدیوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان دنیا میں اگر سو سال تک جیتا ہے۔ مگر اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ جیسا آیا تھا ویسا ہی واپس چلا گیا۔

پونہ سے واپسی کے بعد جو خطوط ملے ان میں سے ایک خط میری لڑکی ام اسلام کا بھی تھا۔ اس نے پونہ کے پروگرام کے بارے میں اخبار میں پڑھا۔ اس کے بعد اس نے ایک خط لکھا جس کا ایک حصہ یہ تھا:

پونہ کے سمیلن کا پروگرام مرہٹی اخبار میں آیا۔ اس میں شمع جلاتے وقت آپ کا فوٹو ہے سب کے ساتھ۔ مگر سب سے زیادہ کمزور اور دبلے آپ دکھائی دے رہے ہیں۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ اور بار بار دل میں یاد آتی رہی کہ سب لوگ کیسے صحت مند ہیں اور میرے ابا کی ایسی حالت۔ اللہ تعالیٰ سے خوب خوب دعا کی آپ کی صحت کے لیے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔ آمین۔

میری لڑکی کو مجھے دبلا دیکھ کر تعجب ہوا۔ مگر مجھے اس پر تعجب ہے کہ لوگ موٹے کیوں ہیں۔ اگر لوگوں کو اس حقیقت کا احساس ہو جائے کہ ہر لمحہ وہ ایک ناقابل بیان قسم کے سنگین حادثہ کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں جس کا نام موت اور قیامت ہے تو لوگوں کا سکون ان سے چھن جائے۔ قہقہے کی آوازیں بلند نہ ہوں۔ فربہ جسم کے مناظر کہیں دکھائی نہ دیں۔

پونہ کے سفر سے واپسی کے بعد جناب عبدالصمد شیخ صاحب کا ایک خط موصول ہوا جو انھیں

کے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

آپ پونہ میں ۲۳ نومبر کی شام میں آئے۔سب سے پہلے یعنی اتوار کے دن ۲۴ نومبر کو حاجی یونس میمن کے گھر پہلی مجلس عصر سے عشاء کی نماز تک ہوتی رہی۔ امت محمدیؐ کے کردار کے بارے میں آپ نے جو نئی بات بتائی وہ یہ تھی کہ اِس امت کے لیے دہرا اجر کیوں ہے؟ اس لیے کہ اس کی ذمہ داری بھی ڈبل ہے۔ خود عمل کرنا اور دوسروں تک پیغام پہنچانا۔

۲۸ نومبر کی رات میں بعد نماز عشاء تنظیم والدین اردو مدارس ضلع پونہ کی جانب سے ایک پروگرام ہوا۔ جس میں پہلے ڈاکٹر فریدہ خانم نے اور پھر آپ نے گفتگو فرمائی۔جس میں مولانا سید نور صاحب نے تلاوت کی جو سورہ بقرہ کی آخری آیات تھیں جس پر آپ نے تقریر کی۔اس میں اہم بات یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے خود ایک دعا مسلمانوں کو سکھائی کہ ہم پر پہلے جیسے لوگوں والا بوجھ نہ ڈال۔آپ نے اِس میں جو بات کہی وہ یہ تھی کہ سیکولرزم نے تاریخ میں پہلی بار اہل توحید کو یہ موقع دیا کہ بغیر کسی خطرے کے اپنے عقائد کی آزادانہ تبلیغ کریں۔

۲۹ نومبر کی رات، عشاء بعد جناب عبدالغفار عبدالرحمٰن صاحب کے مکان پر جو نیو ایرا سوسائٹی گول ٹیکڑی پونہ میں ہے جہاں پر تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے تھے تقریر کی۔اس میں یہ بات بہت ہی نئی تھی کہ یہود انسان کی رسی پر رہیں گے (آل عمران ۱۱۲) تشریح میں یہ کہا گیا تھا کہ رسی سے مراد کسی کی گارنٹی پر رہیں گے جیسے امریکہ کی۔اور آج مسلمان بھی اسی طرح کسی نہ کسی کی گارنٹی پر زندہ ہیں۔

یہ چند باتیں جو مجھے یاد تھیں لکھ رہا ہوں۔ایک بات جو آپ نے خلیفہ کے تعلق سے امام ابن تیمیہ کے حوالے سے کہی تھی کہ ابن تیمیہ کا فتویٰ ہے کہ خلیفۃ اللہ کہنا ناجائز ہے وہ بہت اہم تھی (فتاویٰ ابن تیمیہ ۲/۴۶۴)

ایک بات آپ نے اور کہی وہ یہ کہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے نبی کریمؐ کی پیشین گوئی ہے کہ وہ لوگ جو یہاں دین توحید کے لیے کوشش کریں گے ان کا ثواب بہت زیادہ ہوگا۔یہ بات بھی لوگوں کو بہت اہم معلوم ہوئی۔

جنوری ۱۹۹۷ کے الرسالہ میں صفحہ ۱۴ پر "زکوٰۃ کا مسئلہ" کے تحت مدوں کے بارے میں جو تفصیل پیش کی گئی ہے وہ پہلی بار شاید آپ نے ہی پیش کی ہے۔ خاص کر اسلام کی اشاعتی مہم کے بارے میں۔

(عبدالصمد شیخ، پونہ، ۲۴ دسمبر ۱۹۹۶)

راجستھان کا سفر

بھارت وکاس پریشد کی دعوت پر راجستھان کا سفر ہوا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ کی صبح کو دہلی سے روانگی ہوئی۔ یکم اپریل کی شام کو دوبارہ دہلی واپس آ گیا۔ ذیل میں اس سفر کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

۳۱ مارچ ۱۹۹۵ کو فجر سے پہلے گھر سے روانگی ہوئی۔ سڑکیں اور راستے بالکل سنسان نظر آئے۔ کہیں کہیں کوئی کار یا اسکوٹر رینگتا ہوا دکھائی دیا جو اس بات کی علامت تھا کہ یہاں کچھ انسان بھی بستے ہیں۔ میں نے سوچا کہ بڑے بڑے شہروں کی رونق اسی وقت ہے جب کہ وہاں زندہ انسان بھی موجود ہوں۔ شہر اگر زندہ انسانوں سے خالی ہو جائے تو اپنے تمام مادی اور ظاہری ساز وسامان کے باوجود یہ شہر شہر نہ رہیں بلکہ بھوت نگر دکھائی دیں۔

دہلی سے مودی لفٹ کی فلائٹ ۱۲۳ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ہندستان میں اب پرائیویٹ ہوائی کمپنیوں کا دور آ چکا ہے۔ مودی لفٹ انھیں میں سے ایک ہے جو ایک انڈین کمپنی اور جرمن کمپنی کے اشتراک سے قائم ہوئی ہے۔

پرائیویٹ کمپنیوں کی کارکردگی ہر لحاظ سے سرکاری کمپنیوں سے بہتر ہے۔ آزادی کے بعد ہندستان کی سیاسی قیادت پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھ میں آئی جو ۱۹۳۶ میں اپنی آٹو بیاگرافی میں لکھ چکے تھے کہ وہ صرف سوشلسٹ نظام (socialist order) کو تمام مسائل کا حل سمجھتے ہیں۔ آزادی کے بعد جنوری ۱۹۵۵ میں آوڈی (مدراس) میں کانگرس کا خصوصی اجلاس ہوا۔ اس میں جواہر لال نہرو کی پرجوش تحریک اور تجویز پر سوشلسٹ طرز کا سماج (socialistic pattern of society) بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

میں نے اس کے بعد ہی اس کے خلاف ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ سوشلزم (معاشی عمل پر حکومت کا کنٹرول) ایک تباہ کن نظریہ ہے۔ اس وقت شاید میں اکیلا تھا جو اس نظریہ کا اتنا شدید مخالف تھا۔ اب یہ بات ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکی ہے۔

چالیس سالہ تجربہ میں ملک تباہی کے آخری کنارے پہنچ چکا ہے۔ اب نئی دہلی کی حکومت اپنی نئی اقتصادی پالیسی کے تحت برلائزیشن کا دور لارہی ہے۔ مگر حالات اتنے زیادہ خراب ہو چکے ہیں کہ بظاہر مزید چالیس سال تک بھی اس کی تلافی ممکن نظر نہیں آتی۔

جہاز میں میرے قریب کی سیٹ پر ادھیڑ عمر کا ایک شخص تھا۔ بظاہر وہ نان ریزیڈنٹ انڈین معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ غالباً دو بیگ تھے۔ کسی معاملہ پر وہ ایئر ہاسٹس سے بحث کر رہا تھا۔ غالباً ایئر ہاسٹس کا اصرار تھا کہ وہ اپنا سامان لاکر (اوپر کے خانہ) میں رکھے۔ اور وہ انھیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ آخر وہ اس سیٹ سے اٹھ کر کسی دوسری سیٹ پر چلا گیا۔ جاتے ہوئے بڑبڑاہٹ کے انداز میں کہہ رہا تھا ـــــــ ہندستان میں رہنا کتنا مشکل ہے:

It is so difficult to live in India.

مودی لفٹ کی مذکورہ فلائٹ کا وقت صبح پانچ بج کر ۵۵ منٹ تھا۔ گھڑی کی سوئی نے جیسے ہی ۵۵ ـ ۵ کا وقت بتایا فوراً جہاز میں حرکت شروع ہوگئی۔ وہ اپنے مقررہ وقت پر اودے پور پہنچ گیا۔

جہاز میں داخل ہوکر ہم لوگ بیٹھے تو ایئر ہاسٹس نے اعلان کیا: مودی لفٹ کی یہ فلائٹ جے پور ہوتی ہوئی اودے پور جا رہی ہے، دہلی سے جے پور کی دوری چالیس منٹ میں پوری کی جائے گی۔

میں نے سوچا کہ میری قریبی منزل جے پور ہے، مگر میری آخری منزل اودے پور ہے تاہم اور آگے بڑھ کر سوچا جائے تو اودے پور بھی میری قریبی منزل ہے، وہ میری آخری منزل نہیں۔ اصل منزل جو اس کے بعد آنے والی ہے وہ موت اور آخرت ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم راہ چلتے ہوئے ایک مسافر ہو۔

مودی لفٹ کا فلائٹ میگزین (Take Off) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون پرواز (Flight) کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ فلارنس کے قریب ۱۴۵۲ میں پیدا ہونے والا لیونارڈو (Leonardo) پہلا شخص ہے جس نے ہوائی پرواز کے لئے ایک علمی

بنیاد (scientific basis) فراہم کی۔ اس نے گہرائی کے ساتھ چڑیوں کا مطالعہ کیا کہ وہ کیسے اڑتی ہیں۔ اس طرح دس سالہ مطالعہ کے بعد اس نے ہوائی پرواز کے ابتدائی اصول وضع کئے۔

"چڑیا" شاید اس لئے تھی کہ انسان کو ہوائی جہاز کی صنعت کی طرف متوجہ کرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اس دنیا میں اشارہ کے انداز میں رکھ دیا ہے تاکہ آدمی ان کا مطالعہ کرکے تمدن کی تعمیر کرے۔ اسی طرح آخرت میں پیش آنے والی حقیقتوں کے پیشگی اشارے بھی اس دنیا میں رکھ دئے گئے ہیں۔ یہاں بھی انسان سے مطلوب ہے کہ ان اشاروں کا مطالعہ کرکے وہ آخرت کی حقیقتوں پر اپنے یقین کو مستحکم کرے۔

ہندستان ٹائمس (۳۱ مارچ ۱۹۹۵) کے پہلے صفحہ پر ایک نمایاں تصویر تھی۔ اس میں وہ فوٹو چھاپا گیا تھا جو امریکہ کی فرسٹ لیڈی (Hillary Clinton) اور ان کی بیٹی (Chelsea) نے آگرہ میں تاج محل کے سامنے بیٹھ کر کھینچوایا تھا۔ صدر امریکہ کی اہلیہ نے تاج محل کو دیکھنے کے بعد بار بار کہا کہ یہاں سے جانے کا جی نہیں چاہتا:

I don't feel like leaving the place.

مغل حکمرانوں نے اس ملک میں عمارتی کشش کے نمونے تو قائم کیے مگر اسلام کی کشش کے اسباب فراہم کرنے میں وہ ناکام رہے۔ انھوں نے اگر ملک میں اسلام کا تاج محل بنایا ہوتا تو شاید یہاں کی سیاحت کرنے والا یہ کہتا کہ ـــــ اسلام کے سوا کوئی اور دین اب مجھے پسند نہیں آتا۔

جہاز میں دوسرے اخباروں کے ساتھ اکنامک ٹائمس (The Economic Times) کا شمارہ ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ بھی تھا۔ اس کے صفحہ اول پر ایک لیبل علیحدہ سے چپکا ہوا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ یہ فلاں سفری کمپنی (Tours and Travels) کی اسپانسر کی ہوئی کاپی (sponsored copy) ہے۔ اور یہ کہ وہ آپ کی اپنی کاپی ہے:

This is your copy.

مسافروں کے ساتھ اس فیاضی کا سبب کیا تھا۔ اخبار کا ہر صفحہ خاموش زبان میں اس کو بتا رہا تھا۔ کیوں کہ وہ زیادہ تر اشتہارات سے بھرا ہوا تھا۔ اس فیاضی کا مقصد مسافر کو "اخبار"

دینا نہیں تھا۔ بلکہ صرف اپنا اشتہار دینا تھا۔ تاکہ وہ ان کے سامانوں کا خریدار بن سکے۔ اپنے انٹرسٹ کے لئے لوگ مفت اخبار تقسیم کر رہے ہیں۔ مگر دوسروں کے انٹرسٹ کے لئے مفت اخبار فراہم کرنے والا کوئی نہیں۔

درمیان میں جہاز چالیس منٹ کے لئے جے پور میں ٹھہرا۔ کچھ مسافر یہاں اترے، اور کچھ نئے مسافر سوار ہوئے۔ وسیع نگاہ سے دیکھا جائے تو زمین بھی اسی قسم کی ایک زیادہ بڑی سواری ہے۔ ہر روز کچھ لوگ اس سے اترتے ہیں اور کچھ نئے افراد اس پر سوار ہوتے ہیں۔ جہاز کے مسافروں کے لئے ہم اترنے اور چڑھنے کا لفظ بولتے ہیں، اور زمین کے مسافروں کے لئے پیدائش اور موت کا لفظ۔

جے پور راجستھان کی ریاستی راجدھانی ہے۔ جے پور ۱۷۲۷ میں آباد کیا گیا تھا تاکہ امبر کی جگہ اس کو راجدھانی بنایا جاسکے۔ یہ ایک منصوبہ بند شہر ہے جس کی سیدھی سڑکوں کے کنارے گلابی رنگ کی عمارتوں کی قطاریں کھڑی ہوئی ہیں۔ دوسری بہت سی تاریخی عمارتوں کے علاوہ یہاں ایک رصدگاہ (جنتر منتر) ہے جو اٹھارویں صدی میں بغداد کی رصدگاہ کے نمونہ پر بنائی گئی تھی۔

جے پور کی ریاست کو بارھویں صدی میں راجپوتوں نے قائم کیا تھا۔ سولھویں صدی میں وہ مغل سلطنت کے ماتحت آگئی۔ ۱۸۱۷ میں اس پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ ۱۹۴۹ میں اس کو راجستھان میں ضم کر دیا گیا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ سو سال پہلے ریاست جے پور کی سرکاری زبان اردو تھی۔ اور عدلیہ اور انتظامیہ دونوں شعبوں میں اردو ہی میں کام ہوتا تھا۔ (ماہنامہ ہدایت جنوری ۱۹۹۵، صفحہ ۸۹)

جے پور میں ایک بڑا مدرسہ (جامعۃ الہدایت) قائم ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے دینی تعلیم کے ساتھ کمپیوٹر اور صنعت وحرفت کو بھی اپنے کورس میں داخل کیا ہے۔ اس کی طرف سے ایک ماہنامہ ہدایت نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ جنوری ۱۹۹۵ میں ایک مضمون کی چند سطریں یہ تھیں:

(غدر کے بعد) علماء کرام نے انگریزوں سے نفرت کے ساتھ انگریزی سے بھی نفرت کر کے

اور انگریزی کی تعلیم کو ناجائز بلکہ حرام قرار دے کر مسلم قوم کے لئے علوم جدیدہ کی تحصیل کے دروازے بند کر دئے۔ اور اس فیصلہ سے برطانی حکومت کے انتقامی اور عیارانہ وشاطرانہ عزائم کے پر لگا دئے۔ انگریزوں سے نفرت حق بجانب تھی۔ لیکن انگریزی جو علوم جدیدہ کے حصول کا ذریعہ تھی اور جس سے سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کر کے مسلم قوم پستی سے ابھر سکتی تھی اور برادران وطن کے شانہ بشانہ چل سکتی تھی، اس کے دروازے مسلم قوم پر خود مسلم علماء نے بند کر دئے (صفحہ ۸۹)۔

میں اضافہ کروں گا کہ انگریزوں سے نفرت کرنے میں بھی ہمارے علماء یقینی طور پر حق بجانب نہ تھے۔ کیوں کہ یہ انگریز ہمارے لئے مدعو کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور مدعو سے داعی کا متنفر ہونا ہرگز جائز نہیں۔

جہاز جے پور سے روانہ ہوکر اودے پور پہنچا۔ یہ ایک چھوٹا ایئر پورٹ ہے۔ یہاں صرف چند جہاز اترتے اور روانہ ہوتے ہیں۔

اودے پور راجستھان کا ایک تاریخی شہر ہے۔ ۱۵۶۸ء میں چتوڑ کے بعد وہ مہاراجہ اودے پور کی راجدھانی بنا۔ اس کے بعد راجہ نے یہاں دو بڑے محل تعمیر کرائے۔ شاہجہاں نے ۱۶۲۸ میں مغل تخت پر قبضہ کرنے سے پہلے جب اپنے باپ جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تھی تو اس وقت اس نے اودے پور کے ایک محل میں پناہ لی تھی۔ اودے پور کی ریاست سیسودیا راجپوتوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں قائم کی تھی۔ ۱۸۱۸ء میں اس پر انگریزوں نے قبضہ کیا۔ ۱۹۴۸ میں اودے پور کو راجستھان میں شامل کر دیا گیا۔

آریہ سماج (۱۸۷۵) کے بانی دیانند سرسوتی نے اودے پور ہی میں اپنی مشہور کتاب سیتارتھ پرکاش لکھی تھی (15/495)

اودے پور ایئر پورٹ پر مسٹر رادھے شیام چیچان اور پربھودیال برلا موجود تھے۔ ان کے ساتھ بذریعہ کار بھیل واڑہ کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں حسب معمول میں ان لوگوں سے معلوماتی انداز کی گفت گو کرتا رہا۔

مسٹر رادھے شیام چیچان ایک صنعت کار ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مرکزی حکومت

کی لبرلائزیشن کی پالیسی سے کیا آپ لوگ متفق ہیں۔ انھوں نے کہاکہ لبرلائزیشن اصولی طور پر
تو درست ہے۔ مگر حکومت کو اسی کے ساتھ ملکی صنعتوں کو انفراسٹرکچر (بجلی، پانی، سڑک
وغیرہ) بھی فراہم کرنا چاہئے۔ ابھی تو یہ حال ہے کہ باہر کی کمپنیوں کو ہر قسم کی سہولت فراہم
کی جارہی ہے۔ مثلاً ان کے سارے کام ایک "ونڈو" پر ہو جاتے ہیں۔ مگر ہم کو دسیوں ونڈو
پر لائن لگانا پڑتا ہے۔ یہ تو کامپٹیشن نہیں ہے۔ یہ تو ایک کو پیچھے کرکے دوسرے کو آگے بڑھنے
کا موقع دینا ہے۔

"راجستھان" کا عام تصور یہ ہے کہ وہ ریگستانی علاقہ ہے۔ راجستھان کی علامتی
تصویروں میں اکثر اونٹ اور صحرا دکھایا جاتا ہے۔ مگر مجھے ایئرپورٹ سے بھیل واڑہ تک
کہیں صحرا اور ریگستان نظر نہیں آیا۔ سڑک کے دونوں طرف درخت اور سبزہ اور کھیت کے مناظر
تھے۔ میں نے ساتھیوں سے اس کا ذکر کیا تو مسٹر برلا نے کہاکہ میں ایک بار ٹرین سے دہلی سے
بھیل واڑہ آرہا تھا۔ راستہ میں ایک خاتون کے ساتھ ان کا بچہ تھا۔ سفر کرتے ہوئے جب
ہماری ٹرین راجستھان میں داخل ہوئی تو لڑکے نے اپنی ممی سے کہا: ممی، راجستھان تو آگیا۔
مگر وہ ریگستان کہاں ہے۔

مسٹر برلا نے کہاکہ اصل یہ ہے کہ راجستھان کے صرف ایک علاقہ میں ریگستان ہے۔ مگر ایسا
چوں کہ دوسری ریاستوں میں نہیں ہے اس لئے راجستھان کی پہچان ریگستان بن گیا۔ اس غلطی
کا تعلق صرف راجستھان سے نہیں۔ اکثر معاملات میں لوگ اس قسم کی غلطی کرتے ہیں، وہ جزئی
پہلو کو کل کی پہچان بنا لیتے ہیں۔

راجستھان کا قدیم نام راجپوتانہ تھا۔ برٹش دور میں یہاں اٹھارہ ریاستیں تھیں۔
جہاں راجپوت راجہ راج کرتے تھے۔ اس لئے اس کا یہ نام پڑا۔ ۱۹۴۷ میں آزادی کے بعد
ریاستیں ختم ہو گئیں اور اس کا مجموعی نام راجستھان رکھ دیا گیا۔

اس علاقہ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہاں کھدائی میں مٹی کے کچھ برتن ملے ہیں۔ کاربن
ڈیٹنگ سے معلوم ہوا ہے کہ ان کی تاریخ ۲۰۰۰ قبل مسیح تک جاتی ہے۔ سولھویں صدی میں
یہاں طاقت ور راجپوت سلطنت قائم تھی۔ لیکن رانا سنگرام سنگھ (سانگا) اور بابر کی لڑائی

میں رانا سانگا کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد یہ علاقہ مغل سلطنت کے تحت آ گیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جہانگیر اور شاہ جہاں دونوں راجپوت ماؤں سے پیدا ہوئے تھے۔ (15/495)

راجستھان راجاؤں کی سرزمین رہی ہے۔ چنانچہ یہاں کثرت سے تعمیری یادگاریں ہیں جو دور قدیم کو یاد دلاتی ہیں۔ ذیل میں اسی قسم کی ایک خوبصورت عمارت کی تصویر دی جا رہی ہے۔ یہ اودے پور کے پاس ہے۔ اس کو راج سمدر یا جے سمدر کہا جاتا ہے۔

اودے پور سے ڈھائی گھنٹہ کا سفر طے کر کے ہم لوگ بھیل واڑہ پہنچے۔ بھیل واڑہ میں میرا قیام یہاں کے سرکٹ ہاؤس میں کیا گیا تھا۔ سرکٹ (circuit) کے معنی ہیں گھیرا۔ سرکٹ ہاؤس کا لفظ انگریزوں کے زمانہ میں رائج ہوا۔ انگریزی حکومت نے شہری مقامات پر ایک رقبہ مخصوص کر کے اس کے اندر بنگلہ نما مکانات بنائے تھے تاکہ انگریز عہدیدار اپنے دوروں کے وقت وہاں قیام کر سکیں۔ اس قسم کے مخصوص علاقے اب بھی ہر شہر میں موجود ہیں، اور

حکومت کے ذمہ دار اپنے سفروں کے دوران وہاں وقتی قیام کرتے ہیں۔ انھیں کو سرکٹ ہاؤس کہا جاتا ہے۔

بھیل واڑہ نے صرف دس سال کے اندر نمایاں ترقی کی ہے۔ بھیل واڑہ نے بھیونڈی کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ حالاں کہ بھیونڈی کو مقابلۃً بہت سے ایڈوانٹج حاصل تھے۔ " سوٹنگ" میں وہ سارے ملک سے آگے نکل گیا ہے۔

مسٹر گووند نارائن راٹھی جو خود بھی بزنس مین ہیں، انھوں نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ "یہاں کے لوگوں میں رسک لینے کی استعداد (capacity) ہے مزید یہ کہ یہاں کے لوگ دنگے سے بہت دور رہتے ہیں۔ یہاں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ اور بزنس کے لئے امن بہت ضروری ہے۔

بھیل واڑہ کی آبادی تقریباً دو لاکھ ہے۔ اس میں ۱۰ فیصد سے کچھ زیادہ مسلمان شامل ہیں۔ یہاں دس مسجدیں ہیں اور اتنی ہی تعداد میں دینی مدرسے ہیں۔ دستور ہند نے مسلمانوں کو برابر کے شہری کا درجہ دیا ہے۔ مگر تعلیم اور اقتصادیات میں پیچھے ہو جانے کی وجہ سے عملاً ہر جگہ وہ " دوسرے درجہ" کی کمیونٹی نظر آتے ہیں۔ اس صورت حال کی ذمہ داری تمام تر صرف مسلمانوں کے نااہل رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے۔

بھیل واڑہ کا یہ سفر بھارت وکاس پریشد کی دعوت پر ہوا۔ بھارت وکاس پریشد کا قیام ۱۹۸۵ میں ہوا تھا۔ اس کے آل انڈیا پریسیڈنٹ سپریم کورٹ کے سابق جج شری آر ایس کھنا ہیں۔ راجستھان میں اس کی چالیس شاخیں ہیں۔

بھارت وکاس پریشد ایک غیر سیاسی ادارہ ہے۔ یہ لوگ تعمیری کاموں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مثلاً اسکول، اسپتال، رفاہ عامہ، خدمت خلق، وغیرہ۔ انھوں نے سوامی ویویکانند کے اس قول کو اپنا ماٹو بنایا ہے کہ راشٹر نرمان۔ وکیتی نرمان۔ یعنی فرد کی تعمیر سے ملک کی تعمیر ہوتی ہے۔ ان کے پروگراموں کے چار اجزاء یہ ہیں: سیوا، سنسکار، سہیوگ، سمپرک۔

ایک بات کا میں نے خود تجربہ کیا۔ اور وہ وقت کی پابندی ہے۔ ان کے تمام پروگرام وقت کی پوری پابندی کے ساتھ انجام دئے گئے۔ ۳۱ مارچ کی شام کے پروگرام میں بھیل واڑہ

کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ چندمنٹ کی تاخیر سے پہنچے۔ مگر منتظمین نے کلکٹر صاحب کا انتظار کئے بغیر ٹھیک وقت پر اپنا پروگرام شروع کر دیا۔ ہر پروگرام ٹھیک مقررہ وقت پر شروع اور ختم ہوتا رہا۔ یکم اپریل کو مجھے بھیل واڑہ سے بذریعہ کار چل کر ساڑھے چار بجے اودے پور پہنچنا تھا۔ اودے پور میں دوپہر کا کھانا تھا۔ اور یہاں کا مشہور قلعہ دیکھنا تھا۔ پھر ایئر پورٹ پہنچنا تھا جس کا وقت ساڑھے چار بجے مقرر تھا۔ سارے پروگراموں کو پورا کرنے کے بعد جب ہماری کار ایئرپورٹ پہنچ کر کھڑی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ گھڑی کی ایک سوئی چار پر تھی اور دوسری سوئی ۳۰ پر۔

مسٹر نریندر لودھا (بھارت وکاس پریشد کے مقامی صدر) کا ٹیلیفون دہلی میں آیا تھا کہ ۳۱ مارچ کو جمعہ کا دن ہوگا۔ اس دن آپ لوگوں کی خاص نماز ہوتی ہے۔ پھر اس کے لئے ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ میں نے کہا کہ آپ کسی مسلمان سے کہہ دیں کہ وہ مجھ کو مسجد میں لے جائے۔ وہاں میں نماز پڑھ لوں گا۔

چنانچہ جمعہ سے پہلے سرکٹ ہاؤس میں کئی مسلمان آگئے۔ ان کے ساتھ جا کر یہاں کی اسٹیشن والی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ نماز پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ دہلی کی مسجد میں جس طرح میں اپنے آپ کو دوسروں سے مانوس پاتا ہوں۔ اسی طرح یہاں بھی اور ساری دنیا میں باہمی انسیت کا احساس ہوتا ہے۔

اس تجربہ کے بعد خیال آیا کہ اسلامی اتحاد کی بنیاد یہی روحانی یگانگت ہے۔ آپ دنیا کے جس حصہ میں جائیں، آپ محسوس کرتے ہیں کہ دوسرے مسلمانوں کا عقیدہ، ان کی سوچ، ان کا اخلاقی اصول، ان کی عبادت کا طریقہ، وہی ہے جو میرا ہے۔ یہی اشتراک عالمی اسلامی اتحاد کی بنیاد ہے۔ مگر کچھ انتہا پسند لوگوں نے بے بنیاد طور پر یہ نظریہ بنایا کہ سیاسی ادارہ اسلامی اتحاد کی بنیاد ہے۔ یعنی ساری دنیا کا ایک خلیفہ ہو اور تمام لوگ اس کے سیاسی عصا کے تحت منظم ہوں۔ یہ ایک بے اصل نظریہ ہے۔ قرآن وسنت میں اس کے لئے کوئی بنیاد موجود نہیں۔

۳۱ مارچ کو دوپہر کا کھانا سرکٹ ہاؤس میں کھایا۔ لمبی میز پر کئی معزز لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

भारत विकास परिषद, भीलवाड़ा
नववर्ष कार्यक्रम दिनांक 31-3-1995 व 1-4-1995
मौलाना वहीदुद्दीन खान सा. का कार्यक्रम दिनांक 31-3-1995

प्रातः काल 5.55 पर देहली से उड़ान
प्रातः काल 7.50 पर डबोक (उदयपुर) पहुंच
प्रातः काल 8.15 पर डबोक से भीलवाड़ा के लिए कार द्वारा प्रस्थान
दोपहर 12.00 बजे भीलवाड़ा (सर्किट हाउस पर) पहुंच
दोपहर 12.30 भोजन (सर्किट हाउस)
दोपहर 1.20 प्रस्थान नमाज हेतु
दोपहर 1.30 से 2.30 तक नमाज
दोपहर 2.55 बजे बैठक हेतु प्रस्थान
अपरान्ह 3.00 से 4.00 बजे तक सदस्यों के साथ बैठक (सूचना केन्द्र)
अपरान्ह 4.00 से 5.00 बजे तक पत्रकार वार्ता (सूचना केन्द्र)
सांय 5.15 से 7.15 तक विश्राम (सर्किट हाउस)
सांय 7.15 पर प्रस्थान विचार गोष्ठी (सभागार हेतु)
रात्रि 9.15 सभागार से सर्किट हाउस
रात्रि 9.30 भोजन (सर्किट हाउस)
रात्रि 10.30 बजे दीप विसर्जन

दिनांक 1-4-1995

प्रातः काल 8.00 बजे अल्पाहार
प्रातः काल 9.00 बजे चुनिन्दा मुस्लिम बन्धुओं के साथ बैठक, वार्ता
प्रातः काल 10.00 बजे चाय
प्रातः काल 10.30 बजे प्रस्थान चित्तौड़ के लिए (कार द्वारा)
दोपहर 11.30 बजे चित्तौड़ पहुंच
दोपहर 11.30 1.30 से तक दुर्ग भ्रमण
मध्यान्ह 1.30 से 2.00 तक भोजन चित्तौड़
अपरान्ह 2.00 बजे डबोक (उदयपुर) हेतु प्रस्थान
अपरान्ह 4.30 बजे डबोक पहुंच
सांय 5.55 बजे डबोक से उड़ान
रात्रि 8.00 बजे दिल्ली पहुंच

میں نے کھانا شروع کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا: بسم اللہ الرحمان الرحیم۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک تعلیم یافتہ ہندو نے اس کا مطلب جاننا چاہا۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب ہے میں شروع کرتا ہوں خدا کے نام سے جو نہایت رحیم اور مہربان ہے۔ اسلام میں بتایا گیا ہے کہ آدمی جب بھی کوئی کام شروع کرے تو وہ ان الفاظ کو اپنی زبان سے دہرائے۔ یہ بندہ کی بندگی کا اظہار اور خدا کی خدائی کا اعتراف ہے۔

۲۱ مارچ کو ۳ بجے سہ پہر میں سوچنا کیندر (انفارمیشن سنٹر) میں نوجوانوں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ تمہیدی تقریروں کے بعد مجھے موقع دیا گیا۔ میں نے اپنے خطاب میں کہا کہ دو باتیں اگر ہمارے اندر آجائیں تو ملک کی ترقی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ آجکل یہ حال ہے کہ لوگ دیش سے صرف لینا جانتے ہیں، وہ دیش کو دینا نہیں جانتے۔ یہ مزاج نہ صرف ملک کے لئے نقصان دہ ہے بلکہ طویل مدت کے اعتبار سے خود افراد کے لیے نقصان کا باعث ہے۔ ہمیں یہ کرنا ہوگا کہ ذاتی مفاد کے مقابلہ میں دیش کے مفاد کو اونچا رکھیں۔

دوسری چیز یہ کہ اس ملک کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندو مسلم جھگڑا ہے۔ یہ جھگڑا تمام تر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ایمرجنسی کے زمانہ میں جب ہندوؤں اور مسلمانوں کو گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا گیا اور وہاں دونوں ایک ساتھ رہے تو ہر ایک نے محسوس کیا کہ ایک دوسرے کے بارہ میں ان کے خدشے بے بنیاد تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اگر کسی طرح صرف اختلاط بڑھ جائے تو تمام غلط فہمیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔

اس میٹنگ کے بعد کافی سوالات آئے جن کا میں نے جواب دیا۔ خاص بات یہ تھی کہ سوالات کے لئے نہایت منظم طریقہ اختیار کیا گیا۔ لوگوں نے کاغذ پر لکھ کر اپنے سوالات صدر صاحب کے پاس بھیج دیئے۔ یہ سوالات ہندی میں لکھے ہوئے تھے۔ صدر صاحب نے ایک ایک سوال کو باری باری پڑھا اور میں نے ہر ایک کا جواب دیا۔ کسی بھی جواب کے بعد دوبارہ سوال نہیں کیا گیا۔ سوالات اور ان کے جوابات یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

سوال: آپ دیش میں آنے والے سمے میں کس پرکار کی راج نیتک شاشن ویوستھا کی سمبھاونا دیکھتے ہیں۔ وشیش کر ورتمان سندربھ میں (پرکاش چندر نکل)

جواب : بظاہر حالات امید کی طرف جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ۱۹۹۲ کے آخر میں میں نے بھاجپا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ لوگ کانگرس کے سیکولرزم کو سوڈو سیکولرزم کہتے ہیں۔ اور خود ہندتو کا نام لیتے ہیں۔ مگر سوڈو سیکولرزم کا بدل ہندتو نہیں ہے بلکہ ٹرو سیکولرزم ہے۔ اب آپ دیکھئے کہ خود بھاجپا کے لیڈر (آڈوانی اور باجپئی) ٹھیک اسی قسم کے الفاظ بول رہے ہیں۔ یہ واضح طور پر ایک صحت مند تبدیلی کی علامت ہے۔

سوال : بھارتیہ سنسکرتی ایوم اسلامک سنسکرتی میں کیا فرق ہے۔ دونوں سنسکرتیوں میں ہم کیا سمانیتا دیں۔ کیا دونوں سنسکرتیاں راشٹر کو سنگھٹت کرنے ایوم نو نرمان میں سہاگی ہو سکتی ہیں

(جگبیر سنگھ چودھری)

جواب : ہماری موجودہ سنسکرتی ایک نئی سنسکرتی ہے۔ اس کا قدیم بھارتی سنسکرتی سے بہت کم تعلق ہے۔ یہ دراصل ہندستانی تہذیب، اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے امتزاج سے بنی ہے۔ اور تہذیب یا سنسکرتی ہمیشہ اسی طرح امتزاج ہی سے بنتی ہے۔ یہی مشترکہ تہذیب ہندستان کی تہذیب ہے اور وہی ہماری ترقی کا ذریعہ ہے۔

سوال : شری رام مندر ایوم بابری مسجد کا مدا مندر ایوم مسجد تک سیمت نہیں رہ کر اب یہ ہندوؤں کی ایوم مسلمانوں پرتی شود کا کارن بن گیا ہے۔ اس کمی کو اب کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔ ایوم اس سمسیا کا کیا سمائک سمادھان ہو سکتا ہے۔ کرپیا پرکاش ڈالیں۔

(دامودر اگروال)

جواب : میں سمجھتا ہوں کہ وقتی طور پر ضرور ایسا ہوا تھا کہ یہ اشو دونوں فرقوں کے لئے پرسٹیج اشو بن گیا تھا۔ مگر حالات کے زور پر اب وہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اب دونوں فرقوں کو محسوس ہونے لگا ہے کہ یہ ایک نان اشو تھا۔ جس کو ہم نے جذبات میں آکر اشو بنالیا۔

سوال : ہندو شبد راشٹر وادشبد ہے۔ پھر بھی راشٹر کے سبھی ورگ کے لوگ اس کو جاتی کا دھرم سمجھ رہے ہیں۔ اس کا کیا کارن ہے۔ آپ کا اس سمبندھ میں کیا وچار ہے (ریکھا رام چندرانی)

جواب : یہ بات کہ ہندو شبد ایک راشٹر وادشبد ہے، یہ صرف کچھ ہندوؤں کا کہنا

ہے جو بہت چھوٹی مائناریٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد ملک کا جو کانسٹی ٹیوشن بنا وہ تمام تر ہندو افراد ہی کا بنایا ہوا تھا۔ مگر اس میں ملک کے شہری کو ہندو نہیں کہا گیا۔ بلکہ انڈین (یا ہندستانی) کہا گیا۔ آپ جب تک کانسٹی ٹیوشن میں ترمیم نہ کر لیں آپ کو ایسا کہنے کا حق نہیں ہے۔

سوال: ایسا کہا جاتا ہے کہ بھارتیہ مسلم آج بھی راشٹر کی مکھیہ وچار دھار اتھا سے کٹا ہوا ہے۔ تھا اس کی کیا وجہ ہے۔ آپ ایسا مانتے ہیں۔ انھیں کیسے جوڑا جاسکتا ہے۔ (ہری کرشن رام چندانی)

جواب: میں اس کو نہیں مانتا کہ مسلمان کسی فیصلہ کے تحت نیشنل مین اسٹریم سے کٹا ہوا ہے۔ جو واقعہ ہے وہ یہ ہے کہ پچھلے قسم کے مسلم لیڈروں نے جذباتی تحریکیں چلا کر مسلمانوں کو تعلیم میں پیچھے کر دیا۔ اس پچھڑے پن کی وجہ سے مسلمان ملک کی عمومی سرگرمیوں میں جڑ نہیں پاتے۔ اس بنا پر وہ کارنر ہو کر رہ گئے ہیں۔ اگر مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنا دیا جائے تو اپنے آپ وہ تمام ملکی سرگرمیوں میں شریک ہو کر مین اسٹریم میں دکھائی دینے لگیں گے۔

سوال: ہندستان کے مسلم سماج میں ابھی بھی یہ ابھیمان بنا ہوا ہے کہ ہم نے بھارت ورش پر راج کیا۔ اسی انک کے کارن وہ بھارتیہ سنسکرتی میں گھل مل نہیں پائے ہیں۔ اس بارہ میں آپ کے کیا وچار ہیں۔ اس کمی کو کیسے دور کیا جاسکتا ہے۔ (رام کمار چھپانی)

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ "مسلم سماج" میں یہ ابھیمان نہیں ہے۔ البتہ کچھ نام نہاد مسلم دانشوروں میں ضرور یہ ابھیمان پایا جاتا ہے اور وہ اس قسم کی بولیاں بولتے رہتے ہیں۔ مگر مسلم سماج میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اور حالات کا رخ بتاتا ہے کہ ایسی سوچ کے لوگ بہت جلد تاریخی میوزیم کا حصہ بن کر رہ جائیں گے۔

سوال: کوئی بستی ہندو بستی نہیں۔ پھر کوئی بستی مسلم بستی کیوں (سنجیو اگروال)

جواب: میرے جاننے میں کسی بستی کا نام مسلم بستی نہیں ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی بستی میں سب مسلمان ہوں تو اس کو کوئی مسلم بستی کہنے لگے۔ اسی طرح کسی بستی میں سب ہندو ہوں تو اس کو کوئی شخص ہندو بستی کہنے لگے گا۔

سوال: انتر راشٹریہ استر سے دیکھا جائے تو آج سامپردائے واد کا زہر ہندستان میں

ہی زیادہ دکھ دائی ہوتا جارہا ہے، ایسا کیوں (نام درج نہیں)

جواب: اس کا سبب ہندستان کا تعلیم میں پچھڑاپن ہے۔ مزید یہ کہ قوموں میں اس طرح کی خرابیاں ہمیشہ انٹرایکشن نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ نوآبادیاتی دور میں ہندستانیوں کا انٹرایکشن دوسری قوموں سے ہوتا تھا۔ آزادی کے بعد نہرو کی "پروٹکشن" کی پالیسی نے یہ انٹرایکشن ختم کر دیا۔ اسی کے یہ سب نتائج ہیں۔ اب نئی سرکاری پالیسی کے تحت دوبارہ ہندستانیوں کا انٹرایکشن دوسری قوموں کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو اپنے آپ یہ برائی ختم ہو جائے گی۔

سوال: کیا دوردرشن یا آکاش وانی سے ایکتا کے نعرے لگانے سے راشٹریہ ایکتا ہو سکتی ہے۔ یدی نہیں تو دونوں ورگوں میں بھائی چارہ کی نیو مضبوط کرنا ہے تو ملّاؤں تتھا سنتوں کو نیترت کرنا ہے تو کون پریرنا دے گا۔ کہیں نہ کہیں دوش ورگوں کا ہے۔ اسے کیسے دور کیا جا سکتا ہے (نام درج نہیں)

جواب: دوردرشن اور آکاش وانی کے پروگراموں سے قومی ایکتا نہیں آسکتی۔ اس کے لئے سچی کوشش ضروری ہے۔ اور یہ سچی کوشش مذہبی اور روحانی لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ ماضی میں صوفیوں اور سنتوں نے ہی میل ملاپ کی فضا بنائی تھی، آج بھی وہی لوگ ایسا کر سکتے ہیں۔

سوال: ایسا کیوں ہے کہ بھارت میں کئی ورگوں کے ہوتے ہوئے بھی سامپردائک تناؤ صرف دو ورگوں ہی میں پھیلتا ہے۔ کیا اس کا کارن مسلم ورگ کی تناشک منوورتی ہے یا دھارمک کٹرپن۔ ہندستان میں ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے مسلم ورگ کو ہزار ورش ہونے کے باوجود سنگھرش کو منوورتی کیوں ہے۔ (نام درج نہیں)

جواب: اس کا صحیح جواب وہ ہے جو ہمایوں کبیر نے دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمان میجاریٹی کیمونٹی کے مقابلہ میں نکسٹ ٹو میجاریٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ وہی نفسیات ہے جس کو ہندی میں ترپریا کہا جاتا ہے۔ بھائی بہن اگر ترپریا ہوں تو ان میں نوک جھونک ہوتا رہتا ہے۔ یہی مسلمانوں اور ہندوؤں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ تاہم بھائی بہن جب بڑے ہو جائیں تو یہ نفسیات ختم ہو جاتی ہے۔ ہندو اور مسلمان تعلیم کی کمی کی بنا پر

ابھی پختگی کی عمر کو نہیں پہنچے۔ تعلیم بڑھنے کے بعد جب دونوں کا شعور پختہ ہوگا تو یہ حالت اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

۳۱ مارچ کی شام کو چار بجے سوچنا کیندر (انفاریشن سنٹر) کے ہال میں پریس کانفرنس ہوئی۔ تقریباً سبھی اخباروں کے نمائندے یہاں موجود تھے۔

بہت سے سوالات کئے گئے۔ اکثر ٹیڑھے قسم کے سوالات تھے۔ مگر میں نے تمام سوالوں کا جواب بالکل ٹھنڈے انداز میں دیا۔ پریس کانفرنس کی رپورٹ، نیز پبلک میٹنگ کی رپورٹ یہاں کے تمام اخباروں میں شائع ہوئی۔

پریس کانفرنس میں ایک ہندو جرنلسٹ نے سوال کیا کہ آجکل دیکھا جا رہا ہے کہ مندر اور مسجد دونوں جگہ جانے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں فرقوں کی مذہبی کٹرتا میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس مسئلہ کا حل آپ کے نزدیک کیا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ مفروضہ درست نہیں۔ مندر اور مسجد میں جانے کا کوئی تعلق کٹرتا سے نہیں ہے۔ وہاں جانے والے من کی شانتی یا روحانی سکون حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آج ہی کی مثال لیجئے۔ آج میں نے جمعہ کی نماز یہاں کی اسٹیشن والی مسجد میں پڑھی۔ دو ہندو بھائی اپنی گاڑی پر مجھ کو وہاں لے گئے تھے جو اس پریس کانفرنس میں اب آپ کے سامنے موجود ہیں۔ آپ ان سے پوچھ لیجئے۔ جب میں مسجد سے نماز پڑھ کر نکلا تو سیکڑوں مسلمان مجھ سے مصافحہ کرنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ حالانکہ تمام لوگ جانتے ہیں کہ میں کٹرتا کے خلاف ہوں۔ اگر وہ لوگ مسجد سے کٹرتا کا سبق لے کر نکلتے تو کبھی بھی مجھ سے ملنے کے لئے اس طرح نہ دوڑ پڑتے۔

میں نے کہا کہ مذہبی کٹرتا کی بات وہ لوگ کرتے ہیں جو سرے سے مذہبی ہی نہیں۔ وہ اپنے سیاسی انٹرسٹ کے لئے مذہب کا اکسپلائٹیشن کر رہے ہیں۔

۳۱ مارچ کی شام کو ساڑھے سات بجے یہاں کے ٹاؤن ہال میں پروگرام تھا۔ وسیع ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ ضلع کلکٹر سے لیکر تاجر اور وکیل اور ڈاکٹر اور پروفیسر تک سبھی لوگ جمع تھے۔ اس میں اصل تقریر میری ہی تھی۔ اور اسی پروگرام کے لئے مجھے یہاں بلایا گیا تھا۔

میں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ ملک کو امن اور ترقی کی طرف لے جانے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے ، دوسری باتوں کے علاوہ میں نے ایک بات یہ کہی کہ کسی قوم کے دانشور قوم کا ذہن بنانے والے (opinion makers) ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک کے دانشوروں نے اس معاملہ میں صحیح کردار ادا نہیں کیا۔ اس کی وجہ سے مسائل پیدا ہوتے رہے۔ لوگوں میں صحیح سوچ نہیں ابھری۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۹۷۱ میں انڈیا نے شیخ مجیب الرحمان کا ساتھ دیا اور پاکستان ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہوگیا تو پاکستان کے دانشوروں نے اپنی قوم میں انتقام کی آگ بھڑکانا شروع کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں انڈیا سے اس کا بدلہ لینا ہے۔ چنانچہ انھوں نے کشمیر کے علاحدگی پسند عناصر کی ہمت افزائی کی۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۹ میں باقاعدہ طور پر وہاں گن کلچر چلوا دیا۔

ایسا ہی کام ہندو دانشوروں کے ایک طبقہ نے کیا۔ انھوں نے بابری مسجد کے معاملے میں ہندو قوم کو یہ بتایا کہ یہ تمہارے لئے دوسری ہار (second defeat) کا مسئلہ ہے۔ ۱۹۴۷ میں تم کو مسلمانوں کے مقابلہ میں ہار ہوئی تھی۔ اب دوسری بار تم کو ہار پر راضی نہیں ہونا ہے۔

دونوں فرقوں کے دانشوروں کو وہ کرنا چاہئے تھا جو دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپانی دانشوروں نے کیا۔ امریکہ نے ایٹم بم گرا کر جب ہیروشیما کو تباہ کیا تو جاپانی انتقامی نفسیات سے بھڑک اٹھے۔ اس وقت جاپانی دانشوروں نے اپنی قوم سے کہا کہ ۱۹۴۱ میں ہم نے امریکہ کے پرل ہاربر کو تباہ کیا تھا ، انھوں نے ۱۹۴۵ میں ہمارے ہیروشیما کو تباہ کر دیا۔ معاملہ برابر ہوگیا۔ اب ماضی کے انتقام کو چھوڑ کر مستقبل کی تعمیر کی فکر کرو۔ اس طرح جاپانیوں کو عمل کا صحیح تعمیری رخ مل گیا۔

اسی طرح پاکستانی دانشوروں کو کہنا چاہئے تھا کہ ہم نے ۱۹۴۷ میں ان کے ملک کو توڑا تھا ، انھوں نے ۱۹۷۱ میں ہمارے ملک کو توڑ دیا۔ معاملہ برابر ہوگیا۔ اسی طرح ہندستانی دانشوروں کو کہنا تھا کہ ۱۹۴۷ میں انھوں نے ہمارے ملک کو بٹوایا تھا جس کا ہمیں غم تھا ، ۱۹۷۱ میں ہم نے ان کے ملک کو دو حصے کرکے معاملہ برابر کر لیا۔ اب اس بات کو چھوڑو اور تعمیر و ترقی کی طرف دھیان لگاؤ۔ مگر بدقسمتی سے دونوں میں سے کسی ملک میں بھی جاپان جیسے دانشور نہیں

ابھرے۔ اس لئے ہم جاپان کی طرح ترقی بھی نہیں کر سکے۔

یکم اپریل کی صبح کو میں سرکٹ ہاؤس (کمرہ نمبر ۴) میں سو رہا تھا کہ باہر سے اذان کی آواز آئی۔ مسجد اگرچہ یہاں سے دور تھی۔ مگر لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ نئے زمانہ کی تکنیک نے کس طرح ہم کو یہ موقع دیدیا ہے کہ ہم خدا کی آواز کو وہاں تک پہنچا سکیں جہاں ہم اپنی زبان سے بولے ہوئے الفاظ کو پہنچا نہیں سکتے۔

میں نے اٹھ کر وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کی۔ دیر تک ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا رہا۔ نئی جگہ پر جب آپ نماز پڑھیں اور رکوع اور سجدہ کریں تو آپ کے اندر نئی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ آپ نئی کیفیات کے ساتھ اپنے رب کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔

صبح کو کچھ لوگ سرکٹ ہاؤس میں آگئے۔ ان سے ملکی اور ملی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ صبح کی چائے کے لئے "سیرت سرائے" والوں نے بلایا تھا۔ ڈاکٹر چھیپا کے ساتھ انھیں کی گاڑی پر سیرت سرائے گیا۔ یہاں ایک مختصر نشست ہوئی۔

سیرت سرائے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ "سیرت سرائے" کے لفظ سے بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ کوئی ٹوٹی پھوٹی گندی جگہ ہوگی۔ مگر یہ نہایت صاف ستھری جگہ تھی۔ اس میں تقریباً ایک سو کمرے ہیں۔ یہ کمرے مسافروں کو معمولی کرایہ پر دئے جاتے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک مفید ملی خدمت ہے جس کی تقلید ہر جگہ کے مسلمانوں کو کرنا چاہئے۔

اس کے بعد صبح ۹ بجے سوچنا کیندر میں جلسہ تھا۔ یہاں ہندو اور مسلمان دونوں اکھٹا ہوئے۔ ایک ہندو بھائی نے قرآن کا ذکر کیا۔ چنانچہ میں نے اپنی تقریر میں قرآن ہی کو موضوع بنایا۔

میں نے کہا کہ پہلی آیت جو قرآن میں اتری وہ اقرأ تھی۔ یعنی علم حاصل کرو۔ اس وقت مکہ میں بہت سے مسائل تھے، مگر ان مسائل کا ذکر نہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ علم حاصل کرو۔ اس سے ایک نہایت اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ قرآن کا طریق عمل ہے ــــ مسائل خواہ کتنے ہی زیادہ ہوں، ان کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے عمل کا آغاز ہمیشہ علم اور شعوری بیداری سے کرنا۔ اس سلسلہ میں قرآن اور اسلامی تاریخ سے تفصیلات بیان کی گئیں۔

اس درمیان میں مسلسل ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ لوگوں نے مختلف قسم کے سوالات کئے اور میں اپنے انداز میں ہر ایک کو جواب دیتا رہا۔ ایک سوال یہ تھا کہ اسلام کیا غیر مسلموں کے تئیں نفرت کی تعلیم دیتا ہے۔

میں نے کہا کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام تمام انسانوں کے ساتھ محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور انسان سے نفرت یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ کسی دل میں جمع نہیں ہوسکتیں ۔ اس سلسلہ میں مختلف حدیثیں پیش کیں جو بتاتی ہیں کہ ایمان کس طرح آدمی کے اندر اعلیٰ انسانی اخلاق پیدا کرتا ہے۔

یکم اپریل کو واپسی تھی۔ بذریعہ کار بھیل واڑہ سے اودے پور کے لئے روانہ ہوا جہاں سے جہاز لینا تھا۔ راستہ میں ہم لوگ کچھ دیر کے لئے چتوڑ میں ٹھہرے جو بھیل واڑہ اور اودے پور کے بیچ میں ہے۔

چتور گڑھ میں ایک بہت بڑی درگاہ ہے۔ اس کا نام ہے" درگاہ قاضی چل پھر شاہ" اس درگاہ کی مسجد میں ظہر کی نماز ادا کی۔ درگاہ کی سیڑھیوں پر ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی عمر کافی ہوچکی تھی۔ انھوں نے مجھ کو دیکھ کر میرے ساتھی سے کہا: حضرت چل پھر شاہ انھیں کی طرح تھے۔ میں نے ان کو اپنی نوجوانی کی عمر میں دیکھا ہے۔

چتور گڑھ نہایت تاریخی مقام ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا قلعہ ہے جو آٹھویں صدی عیسوی میں بنایا گیا تھا۔ سولھویں صدی تک یہ شہر ریاست میواڑ کی راجدھانی تھا۔ یہاں سیسودیا راجپوت راج کرتے تھے۔

مسلم عہد میں سب سے پہلے علاء الدین خلجی نے ۱۳۰۳ء میں اس کا محاصرہ کیا۔ گجرات کے بہادر شاہ نے ۱۵۳۴ میں اور اکبر نے ۱۵۶۷ میں اس کا محاصرہ کیا۔ لیکن راجپوتوں نے نہایت بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ مرد بڑی تعداد میں مارے گئے اور عورتوں نے اجتماعی خودسوزی کی رسم (جوہر) کے تحت اپنا خاتمہ کرلیا۔ مگر انھوں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ پہلی بار ۱۵۶۸ء میں اکبر اس کو فتح کرنے میں کامیاب ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں تیس ہزار راجپوت ہلاک ہوگئے (9/380)

اس وسیع قلعہ کے اندر بہت سی عمارتیں ہیں۔ انھیں میں سے ایک پدمنی محل بھی ہے یہاں فاصلہ کے ساتھ نیچے اوپر دو عمارتیں بنی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان خلجی کی فرمائش پر نیچے کی عمارت میں رانا پرتاپ سنگھ کی رانی پدمنی بیٹھی جو بہت خوبصورت تھی۔ دوسری طرف سامنے کی عمارت میں بڑا سا آئینہ دیوار پر لگا تھا۔ اس آئینہ میں نیچے کی بالمقابل عمارت دکھائی دیتی تھی۔ سلطان علاء الدین خلجی نے اس آئینہ میں رانی پدمنی کا عکس دیکھا۔ وہ اس پر فریفتہ ہوگیا۔ مگر پدمنی نے سلطان کا پیغام قبول کرنے سے انکار کردیا۔ دوسری راجپوت خواتین کے ساتھ جوہر (خود سوزی) کے ذریعہ اس نے اپنا خاتمہ کرلیا۔ بورڈ میں اس کی بابت یہ الفاظ درج ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ سلطان خلجی نے پدمنی کو آئینہ کے ذریعہ دیکھا تھا:

Khilji is said to have seen her through mirrors.

چتور گڑھ کی ایک قابل دید چیز وجے استمبھ (Tower of victory) ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا قلعہ ہے۔ اس قلعہ کے اندر یہ استمبھ واقع ہے:
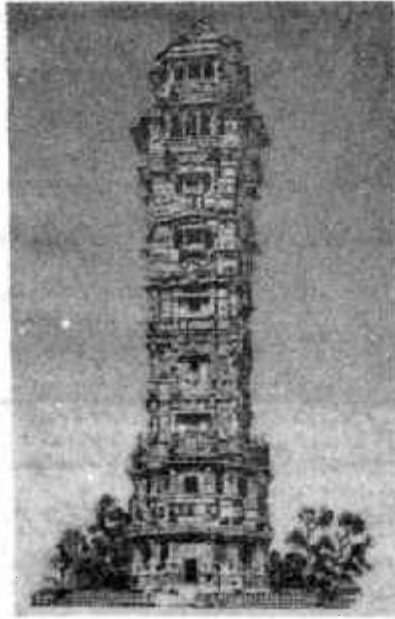
یہ ۱۲۲ فٹ اونچا ایک مینار ہے۔ اس کا اصل نام وجے استمبھ ہے۔ یعنی منارۂ فتح۔ یہاں آرکیالوجی کی طرف سے جو بورڈ لگایا گیا ہے اس پر لکھا ہوا ہے کہ رانا کمبھا کو ۱۴۴۰ء میں سلطان محمود خلجی (مالوہ) پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ اس فتح کی یادگار کے طور پر رانا نے ۱۴۶۸-۱۴۵۸ء میں یہ استمبھ بنوایا۔ اس کی تعمیر پر جو پتھر لگائے گئے ہیں ان پر ہندو دیوی دیوتاؤں کی تصویریں تراش کر بنائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ہتھیاروں اور موسیقی کے سامانوں کی تصویریں بھی تراشی گئی ہیں۔ اسی کے ساتھ استمبھ کے اندر عربی رسم الخط میں اللہ بھی لکھا ہوا ہے۔

استمبھ کے باہر آرکیالوجی کا جو بورڈ لگا ہوا ہے اس پر اس کی بابت یہ الفاظ درج ہیں کہ استمبھ کی تیسری اور آٹھویں منزل پر عربی میں لکھا ہوا لفظ اللہ بتاتا ہے کہ راجہ دوسرے مذہبوں کا بھی کتنا احترام کرتا تھا:

The word "Allah" inscribed in Arabic in 3rd and 8th stories shows the regard of other faiths also.

مہارانا پرتاپ سنگھ (میواڑ) اور شہنشاہ اکبر کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ پرتاپ سنگھ کا سپہ سالار ایک مسلمان حکیم خاں سوری تھا۔ اور اکبر کا سپہ سالار ایک ہندو راجہ مان سنگھ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل دور میں جو لڑائیاں ہوئیں وہ صرف سیاسی بالادستی کی لڑائیاں تھیں۔ ان کا کچھ بھی تعلق مذہب سے نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو راجہ کی فوج میں مسلمان اور مسلم بادشاہ کی فوج میں ہندو ہوتے تھے۔ حتی کہ مذکورہ مثال کے مطابق، ہندو راجہ نے مسلم بادشاہ پر اپنی فتح کا مینار تعمیر کیا۔ تو اس کی دیواروں پر اس نے ہندو مذہبی علامتوں کے ساتھ عربی رسم الخط میں اللہ کا نام بھی درج کیا

اودے پور کا قلعہ دیکھنے کے بعد ہم لوگ ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ ہم اپنے پروگرام کے مطابق، ٹھیک وقت پر ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ مگر وہاں معلوم ہوا کہ جہاز لیٹ ہے۔ میری واپسی انڈین ایئر لائنز کے جہاز سے تھی۔ لیکن انڈین ایئر لائنز میں تاخیر ایک عام چیز ہے۔ اور وقت پر روانگی صرف ایک استثنا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے باصرار کہا کہ آپ لوگ چلے جائیں۔ مگر وہ لوگ آخر وقت تک ایئر پورٹ پر ٹھہرے رہے۔ جہاز کا مقرر وقت پونے چھ بجے

تھا۔ مگر جہاز عملاً ساڑھے سات بجے روانہ ہوا۔

ادے پور سے انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ ۴۹۴ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں انڈین ایئر لائنز کے دو فلائٹ میگزین (سواگت) دیکھے۔ مارچ ۱۹۹۵ کے شمارہ میں ایک مضمون آگرہ کی کیتھولک سیمٹری (مسیحی قبرستان) کے بارہ میں تھا۔

اس میں بتایا گیا تھا کہ آگرہ کے اس قبرستان میں جن انگریزوں کی قبریں ہیں ان میں سے ایک انگریز سوداگر ملڈن ہال (Johan Mildenhall) ہے۔ وہ ۱۶۰۳ میں مغل دربار میں آیا۔ اس کے پاس الزبتھ اول کا ایک تعارفی خط تھا۔ اس میں مغل حکمراں سے ہندستان میں تجارت کی اجازت مانگی گئی تھی۔ اکبر نے کسی قدر تردد کے ساتھ تجارت کی اجازت دے دی۔ بعد کو سر ٹامس رو (Sir Thomas Roe) جہانگیر کے دربار میں آیا اس نے جہانگیر سے بات کر کے اس سے مزید رعایتیں حاصل کر لیں۔ اس طرح ہندستان میں انگریزوں کے نفوذ کے لئے دروازہ کھل گیا:

Thus heralding the rise of the British in India (p. 42)

انڈین ایئر لائنز کا فلائٹ میگزین سواگت (اپریل ۱۹۹۵) دیکھا۔ اس میں تقریباً انگریزی اور نصف ہندی مضامین ہوتے ہیں۔ ہندی شعبہ میں ایک مضمون کا عنوان تھا: رہے گا بانس تو بجے گی بانسری۔ عنوان سے بظاہر یہ خیال ہو رہا تھا کہ یہ مضمون "بانسری" کے بارہ میں ہوگا۔ لیکن پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ بانسری کا ذکر اس میں محض ضمنی طور پر ہے۔ اصلاً یہ مضمون بانس کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ بانس ایک بہت مفید درخت ہے اور بانسری کے علاوہ اس کے بہت سے استعمال ہیں۔ مختلف ملکوں میں بانس کے استعمالات بتائے گئے تھے۔

میں نے سوچا کہ محض عنوان یا کوئی ظاہری پہلو دیکھ کر کسی چیز کے بارہ میں رائے قائم نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ اس کو پوری طرح دیکھنا اور سمجھنا چاہئے۔ عین ممکن ہے کہ جزء کو دیکھ کر بظاہر جو رائے بنی تھی، وہ کل سے واقفیت کے بعد بدل جائے۔

انگریزی روزنامہ ہندو کا شمارہ یکم اپریل ۱۹۹۵ دیکھا۔ اس میں ایک خبر یہ تھی کہ گجرات کی حکومت نے ریاست کے تمام پرائمری اسکولوں، سکنڈری اسکولوں اور ہائر سکنڈری

اسکولوں کے لئے لازم قرار دیدیا ہے کہ تمام طلبہ روزانہ اجتماعی طور پر بندے ماترم کا ترانہ گائیں۔ ایجوکیشن منسٹر مسٹر نلین بھٹ نے اسٹیٹ اسمبلی میں اس کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ وندے ماترم بچوں کے اندر حب الوطنی، قومیت کا جذبہ پیدا کرنے میں مددگار ہوگا اور پوری قوم کو متحد کرنے کا ذریعہ بنے گا:

Vande Mataram would help the children in developing patriotism and nationalism and would be a vehicle to unite the entire nation. (p. 9)

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ ترانوں سے کبھی کوئی قوم نہیں بنتی۔ ۱۹۴۷ سے پہلے پوری پاکستانی قوم نے یہ ترانہ گایا تھا اور اب بھی گاتی ہے کہ ـــــ پاکستان کا مطلب کیا، لاالٰہ الا اللہ۔ لیکن مزاج اور کردار کی تعمیر کے اعتبار سے اس کا ایک پرسنٹ فائدہ بھی نہیں ہوا۔ یہی انجام بندے ماترم کا بھی ہوگا۔ اسکول کے بچے تو درکنار، اگر انڈیا کے تمام لوگ ہر روز صبح کو یہ ترانہ گائیں تب بھی اس کا کوئی حقیقی عملی نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں۔ اس طرح کے ترانے صرف بڑوں کو خوش کرتے ہیں، وہ بچوں کے تعمیر کردار میں کچھ بھی مددگار نہیں ہوتے۔

یکم اپریل ۱۹۹۵ کی شام کو ۹ بجے دہلی واپس آگیا۔ ایک غلط فہمی کی وجہ سے یہاں ایئرپورٹ پر لوگ دیر میں پہنچے۔ مجھ کو تقریباً پندرہ منٹ کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرنا پڑا۔ یہ پندرہ منٹ اتنا لمبا معلوم ہوا کہ میری زبان سے نکلا کہ خدایا، اس دنیا میں پندرہ منٹ کا انتظار بھی برداشت نہیں ہوتا۔ قیامت میں انسان کا حال کیا ہوگا جب اس کو لامعلوم مدت تک انتظار کی حالت میں کھڑا رہنا پڑے گا، جب کہ وہاں کا ہر منٹ دنیا کے منٹ سے بے حساب حد تک زیادہ سخت ہے۔